سفینہ اور نور

میراثنیں

انہی دنوں علی پور میں میراثنوں کا ایک نیا ٹولہ آیا تھا۔ ان میں ایک میراثن زہرہ غضب کی رسیلی تھی۔ جب وہ گاتی اس کا حلیہ ہی بدل جاتا۔ اس پر ایک عجیب کیفیت چھا جاتی ایسی کیفیت کہ دیکھنے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے۔

محلے کے جوان بیچارے انتظار میں رہتے تھے کہ کوئی بہانہ ہاتھ آئے تو وہ میراثنوں کو بلائیں اور چھت پر چاندنی بیٹھ کر زہرہ کو گاتے دیکھیں۔

کوٹھے پر ایک طرف عورتیں بیٹھ جاتیں۔ درمیان میں میراثنوں کے لیے جگہ مقرر کر دی جاتی۔ دوسری طرف محلے کے جوان بیٹھ کر زہرہ کی طرف متبسم نگاہوں سے دیکھتے۔ جب وہ عورتوں کی طرف دیکھتی تو اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوتی۔ لیکن جب وہ جوانوں کی طرف آنکھ اٹھائی تو دفعتاً گویا سوکھا ہوا پھول از سر نو تازہ ہو جاتا اس پر جوانوں کے ہاتھ چپ چاپ جیبوں میں کچھ ٹٹولنے لگتے۔ زہرہ کے ساتھیوں کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ جاتی اور ان کی تانوں میں جوش پیدا ہو جاتا۔

محلے کی عورتیں میراثنوں کو پسند نہ کرتی تھیں اگرچہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور تھیں کہ ان کے آنے سے محلے میں رونق کی لہر دوڑ جاتی ہے اور تقریب میں چہل پہل پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر نوجوانوں کا مسکرا مسکرا کر زہرہ کی طرف دیکھنا اور روپے پر روپے دیتے جانا انہیں بے حد ناپسند تھا۔

محلے میں صرف چند ایک لڑکیاں ایسی تھیں جو محلے کی عام عورتوں کے برعکس ایسے مواقع پر خوش دکھائی دیا کرتی تھیں ان میں شہزاد پیش پیش تھی۔ ڈھولک کی آواز سن کر اس کی آنکھوں میں گلابی چھینٹے اڑنے لگتے شانوں پر ریشمیں دوپٹے جا سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ بازو یوں بات بات پر لہراتے جیسے کتھا کلی کے مندرا ادا کر رہی ہو۔ اس کی تو آواز بھی بدل جاتی تھی۔ گلے کے سر چڑھ جاتے اور بات میں تھا۔ لوچ پیدا ہو جاتا۔

شہزاد کی اس بات پر محلّہ والیوں میں چہ میگوئیاں ہوتیں۔ دبی دبی آوازیں سنائی دیتیں۔

''آخر خاندان کا اثر نہیں جاتا بہن۔''

''خود بھی تو گاتی ہے۔ سنا تھا۔ جب دولہن بن کر آئی تھی خود ہی اپنے بیاہ پر گانے لگی تھی۔ توبہ ذرا نہ جھجکی۔''

''میں کہتی ہوں چاچی یہ چیزیں خون میں ہوتی ہیں ہاں کہے دیتی ہوں۔''

''سچ کہتی ہو بیٹی۔ زمانے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔''

''ابھی تو دیکھتی جاؤ چاچی۔ ابھی دیکھا کیا ہے۔''

''نہ اللہ نہ کرے۔ اب تو خدا اٹھا ہی لے تو اچھا ہے بہن۔''

''توبہ وہ تو ان میخوں پر بچھے جاتے ہیں۔''

جب سے شہزاد محلے میں آئی تھی۔ محلّہ والیاں اسے حیرانی سے دیکھتی تھیں اور منہ میں انگلی ڈال کر کھڑی کی کھڑی رہ جاتیں۔ مگر شہزاد نے کبھی اس تفصیل کو اہمیت نہ دی تھی۔ اسے محسوس ہی نہ ہوا تھا کہ وہ اس کی طرف حیرانی سے دیکھتی ہیں اور اس کی حرکات کا بغور جائزہ لیتی ہیں۔

وہ چلتے چلتے چاچی کی طرف دیکھ کر شور مچا دیتی۔ ''سنا چاچی کس کا انتظار کر رہی ہے۔ فکر نہ کرو اب آتے ہی ہوں گے۔ چچا۔'' اور پیشتر اس کے کہ چاچی جواب دیتی وہ اس کے پاس سے نکل جاتی اور کسی اور سے جا کر بات کرنے لگتی۔

''بابا عمرو ہیں۔ سلام کہتی ہوں بابا۔ نماز پڑھ کر آئے ہو۔ یہ کس وقت کی نماز ہوئی۔ دن میں نو نمازیں پڑھتے ہو کیا۔'' اور پیشتر اس کے کہ بابا کچھ کہیں وہ کسی بچے سے بات شروع کر دیتی۔

شہزاد کی حادثیں انوکھی تھیں جو محلے والیوں کی نگاہوں میں کھٹکتیں مگر اس کی ہنس مکھ

طبیعت کی وجہ سے۔

رفیق اور سکینہ

محلّہ والیاں خاموش رہتی تھیں۔ پھر بھی دبی دبی رہنے کے باوجود بات نہ دبی اور محلّہ والیوں کی سرگوشیاں جاری رہیں۔ ''ہرنی ہے ہرنی۔'' وہ اسے دیکھ کر کہتیں۔ ''کلیلیں بھرتی ہے۔'' شاید اس لیے کہ اکیلی شہزاد کے متعلق سرگوشیاں کرنا آسان نہ تھا۔ جب تک دو نام منسلک نہ ہوں سرگوشیوں میں لذت پیدا نہیں ہوتی۔

اس لئے آہستہ آہستہ ان سرگوشیوں میں شہزاد کے ساتھ رفیق کا نام شامل کرلیا گیا اور محلے والیاں رفیق کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ شاید رفیق کی طرف انگلیاں نہ اٹھتیں مگر مشکل یہ تھی کہ رفیق کی شادی ہو چکی تھی اور وہ بچپن ہی میں سکینہ کا خاوند بن چکا تھا جو اس کی ہر حرکت پر کڑی نگاہ رکھتی تھی اور اس کی ہر جنبش میں مقصد ڈھونڈتی تھی۔ رفیق کی آنکھوں میں بوندا باندی ہوتی دیکھ کر اس کے کپڑوں میں عطر کی خوشبو محسوس کر کے وہ ایک گہری سوچ میں پڑ جاتی۔

رفیق اور سکینہ ایک قدامت پسند گھرانے کے افراد تھے۔ خاوند بیوی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر مل نہیں سکتے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لئے بھی انہیں بہانوں کا سہارا لینا پڑتا تھا اور پھر موقعہ اور محل کو دیکھنا پڑتا۔ رفیق کو رومال دھلوانا ہوتا تو وہ رومال پکڑ کر چھت کی طرف گھورتے ہوئے یوں گنگناتا جیسے کوئی منتر پڑھ رہا ہو۔ ''میں کہتا ہوں اسے دھو ڈالنا آج۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سکینہ کی طرف قطعی طور پر نہ دیکھتا اور چولہے کے قریب بیٹھی ہوئی، سکینہ ہنڈیا میں جھانکتے ہوئے گنگناتی ''رکھ دیجئے۔'' پھر رفیق رومال کو جھاڑ کر یوں گرا دیتا جیسے مداری تماشا دکھا رہا ہو۔ پھر وہ باہر نکل جاتا اور سکینہ لمبا گھونگٹ سنبھالے آتی اور گرا ہوا رومال اٹھا لیتی اور اس کی سمت قطعی طور پر نہ دیکھتی۔ جس سمت کو رفیق گیا ہوتا۔ ان حالات میں سکینہ اپنے شوہر کو نیچی نظروں سے دیکھنے کے سوا اور کر ہی کیا

سکتی تھی۔اس کے برعکس رفیق شہزاد سے سر اٹھا کر ملتا تھا۔اگر چہ بات عزت سے کرتا تھا۔لیکن اس کا بہانے بہانے شہزاد سے ملنا ''چچی کچھ منگوانا تو نہیں۔میں بازار جارہا ہوں۔چچی ایسے اچھے چاول آئے ہیں۔بنواری لال کی دوکان پر منگوانے ہیں کیا۔چچی چائے سستی ہوگئی ہے۔چچی بڑا اچھا کپڑا منڈی میں آیا ہے۔''

دن میں رفیق دوبار شہزاد کی طرف جاتا اور پھر دیر تک آہستہ آہستہ اس سے باتیں کرتا رہتا اور باتوں کے دوران میں سی سی کرنے کے علاوہ جھجکتا اور گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا۔اس وقت اس کی آنکھوں سے پھلجھڑیاں چلتیں اور کانوں پر سرخ چیونٹیاں رینگتیں۔

رفیق کی بیوی سکینہ اسے شہزاد کی طرف آتے دیکھ کر اپنے لمبے گھونگٹ سمیت کوٹھے پر چڑھ آتی اور ان کی طرف کھڑکی چھت یا طاق سے چوری چوری جھانکتی۔ انہیں قریب قریب کھڑے دیکھ کر رفیق کے متعلق نہ جانے کیا کیا اندازے لگاتی۔ پھر اکیلے میں بیٹھ کر آنسو بہاتی اور محلے والیاں اسے اداس دیکھ کر چہ میگوئیاں کرتیں اور ان کی سرگوشیوں میں رفیق اور شہزاد کے نام سنائی دیتے۔

ایلی نے بھی کئی ایک بار انہیں یوں قریب کھڑے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا اور خواہ مخواہ اس کے دل میں بھی جلن پیدا ہوئی تھی۔پھر تنہائی میں بیٹھ کر سوچتا رہا تھا۔ ''رفیق اثر پیدا کر سکتا ہے تو کیا ہے۔''اس نے لاحول پڑھ کر اس خیال کو دل سے نکال دیا تھا۔لیکن یہ تو اس زمانے کی بات تھی جب اسے تسلیم سے محبت نہ ہوئی تھی۔ اب تو جب بھی وہ شہزاد کی طرف دیکھتا تو اس کی نگاہوں میں شہزاد کے خدوخال دھندلے پڑ جاتے اور اس رنگین دھندلکے میں سفید دھبے چمکتے اور گھنگھریالے بالوں کی لٹ لہراتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ شہزاد نہیں بلکہ تسلیم ہو جیسے تسلیم نے بھیس بدل رکھا ہو۔

علی پور کے ان مشاغل میں ایلی کی چھٹیاں گویا چشم زدن میں ختم ہو گئیں۔ اور وہ علی پور سے امرتسر چلا آیا کالج جانے سے پہلے وہ آصف کے گھر گیا اور دیر تک اسے آوازیں دیتا رہا بالآخر ان کا نوکر نیچے آیا۔ ''آصف صاحب ہیں۔'' اس نے پوچھا۔ ''جی میں دیکھتا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟'' آصف نے تو کبھی ایسا نہ کیا تھا۔ جب بھی ایلی اس تنگ گلی میں کھڑا ہو کر آواز دیتا تو کھڑکی سے آصف جھانکتا اور مسکرا کر کہتا۔ ''آیا ابھی۔'' اس سے پہلے نوکر نے کبھی نیچے آ کر نہ کہا تھا۔ ''جی میں دیکھتا ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے۔''

نوکر دوسری بار آیا۔ ''جی آیئے۔'' وہ بولا۔ وہ اسے بیٹھک میں لے گیا۔ ''بیٹھئے وہ ابھی آتے ہیں۔'' وہ بیٹھک بہت ہی مختصر سا کمرہ تھا جس کے ایک کونے میں پلنگ پڑا تھا اور دوسری جانب ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، دو بڑی کھڑکیاں اور روشندان گلی میں کھلتے تھے۔ ایلی نے آصف کی بیٹھک کو دیکھ کر محسوس کیا جیسی وہ بدلی بدلی سی ہو۔ پہلے تو اس میں اتنا اندھیرا نہ ہوتا تھا نہ ہی وہ اس قدر ویران تھی۔ پہلے روشندانوں میں شیشے لگے ہوئے تھے لیکن اب ان پر ٹاٹ لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد آصف داخل ہوا اس کا چہرہ زرد تھا آنکھیں روئی روئی نظر آتی تھیں اور انداز میں جھجک تھی۔ ایلی کی طرف دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی مسکراہٹ بے حد اداس تھی۔

''تم آ گئے۔'' وہ بولا۔ ''میں محسوس کر رہا تھا کہ تم کبھی نہیں آؤ گے اور کالج ہمیشہ بند پڑا رہے گا اور.....اور.....'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تم بیمار ہو کیا؟'' ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔ ہاں بیماری سمجھ لو۔'' وہ بولا۔

''کیا تکلیف ہے؟'' ایلی نے پوچھا۔

''تکلیف۔'' آصف مسکرایا۔ ''تکلیف نہیں روگ لگا ہے۔'' وہ ایلی کے قریب تر ہو کر زیر لب باتیں کر رہا تھا۔ جیسے اپنی آواز سے ڈر رہا ہو۔

''آخر بات بھی تو بتاؤ نا؟'' ایلی نے چیخ کر کہا۔

آصف گھبرا گیا۔ ''خدا کے لیے آہستہ بولو۔ کوئی سن نہ لے۔''

''کون سن رہا ہے تمہاری بات۔'' ایلی نے پوچھا۔

''سن رہا ہے۔ سن رہا ہے۔'' اس نے روشن دانوں کی طرف اشارہ کیا۔

عین اس وقت گلی میں کسی نے قہقہہ لگایا۔ ایلی چونکا۔ ''یہ کون ہنس رہی ہے؟''

''چلو یہاں سے چلیں۔'' وہ گھبرا کر بولا۔ ''لیکن ایسے نہیں تم پہلے جاؤ میں آ جاؤں گا۔ بازار میں ملوں گا۔ جلدی کرو جلدی۔''

اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ''کھڑکی کھول دو۔'' قریب ہی سے پھر وہ عجیب و غریب آواز آئی۔

''یہ ہے کون؟'' ایلی نے پوچھا۔ آصف کا چہرہ اور بھی زرد پڑ گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ ''خدا کے لیے بازار میں میرا انتظار کرنا۔ شاید مجھے دیر ہو جائے۔''

عین اس وقت ایک ڈبل اینٹ روشندان کے ٹاٹ سے ٹکرا کر دھڑام سے گلی میں گری۔

باہر نکلتے ہوئے ایلی نے چوری چوری ایک نظر مقابل کے چوبارے میں ڈالی۔ کھڑکی میں کوئی کھڑا تھا۔ اس کے سیاہ لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''اس سے کہو باہر نکلے۔'' وہ چلائی۔

ایلی ڈر کر بھاگا کہ کوئی اینٹ اس کے سر پر نہ گر جائے۔

کوئی نہیں کسی سے نہیں

بازار میں وہ دیر تک ٹہلتا رہا مگر آصف نہ آیا اس کا جی چاہتا تھا کہ پھر سے گلی میں

داخل ہو جائے اور جا کر اسے آواز دے مگر جرأت نہ پڑتی تھی۔ نہ جانے وہ اینٹ کس نے ماری تھی نہ جانے وہ اسے ڈانٹ کیوں رہی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھی اور حالات کیا تھے۔ دیر تک وہ کھڑا سوچتا رہا اور پھر ان جانے میں اس نے اپنا رخ آغا کے گھر کی طرف موڑ لیا اور پھر جو اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ تسلیم کی سیڑھیوں میں کھڑا تھا۔ غیر از معمول اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن گھر گویا ویران پڑا تھا کوئی آواز نہیں آ رہی تھی ڈیوڑھی زینہ اور بیٹھک سب ویران پڑے تھے۔ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ دور سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

''کون ہے؟'' تسلیم کی آواز سن کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ دروازے میں تسلیم کا سفید دوپٹہ لہرایا اور پھر ایک گھنگھریالی لٹ جھلکی۔

''تسلیم۔'' ایلی نے زیر لب کہا۔

''اوئی اللہ۔'' وہ چلا کر پیچھے ہٹ گئی اور پھر ہنسنے لگی۔

''گھر کوئی نہیں۔'' وہ ہنستی ہوئی بولی۔ اس کی ہنسی میں واضح اشارہ تھا۔

''مجھے کوئی نہیں سے ملنا ہے۔'' ایلی نے کہا۔

''کوئی نہیں۔ کسی سے نہیں ملتے۔'' وہ پھر ہنسی۔

''ہاں ہاں۔'' ایلی نے کہا۔ ''میں کسی سے نہیں ہوں۔''

''پڑے ہو۔'' وہ تنک کر بولی۔ ''ہم کیا کریں۔''

''یہی تو بتانے آیا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''کہ تم کیا کرو۔''

''نہ جی۔'' وہ کہنے لگی۔ ''ہمیں نہ بتایئے کچھ۔ ہم نہیں سنتے ایسی ویسی بات۔ کہو کام کیا ہے؟''

''کام وہ آن پڑا ہے۔'' ایلی گنگنانے لگا۔ ''خدا کے لیے ذرا دروازے میں تو آؤ۔''

''نہ میں نہیں آتی۔''

''ضروری بات ہے۔'' وہ منتیں کرنے لگا۔

''پڑی ہو۔'' وہ بولی۔

ایلی نے دروازہ کھول دیا۔ ''اچھا تو میں آتا ہوں۔'' ''خدا کے لئے۔ خدا کے لئے۔'' وہ چلائی۔ ''وہ آنے ہی والے ہیں۔''

''تو پھر وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ملو گی۔'' ایک فاتح کی طرح اس کی باچھیں کھل گئیں۔

''ملنے سے مطلب!'' وہ بولی۔

''تمہیں دیکھنا ہے۔'' ایلی نے جواب دیا۔

''دیکھنا ہے۔'' وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ ''دیکھ کر کیا لیں گے۔''

''کیا لینے دینے کے بغیر دیکھا نہیں جا سکتا۔''

''بس جی بس۔'' وہ چڑ کر بولی۔ ''اب جانے دو ورنہ۔''

''ورنہ۔'' وہ چلایا۔ ''میں اندر آ رہا ہوں.....''

''نہیں نہیں۔'' اس نے منت کی۔

''تو پھر ملنے کا وعدہ کرو جلدی۔''

''ملوں گی ملوں گی۔''

''کب؟''

''کہہ جو دیا ملوں گی۔ جاؤ نا اب۔ جاؤ بھی۔'' وہ چڑ کر بولی۔

ایلی سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچنے لگا۔ اگر وہ اوپر سے ایک ڈبل اینٹ مارے یا پتھر ہی سہی تو زندگی کتنی دلفریب ہو جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو جائے کوئی شرارت۔ کوئی شرارت۔ کوئی حرکت۔ جس سے زندگی زندگی بن جائے چاہے جو کچھ بھی ہو یہ سوچتا ہوا وہ چپ چاپ آموں کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

جونہی وہ بورڈنگ میں پہنچا۔ اللہ داد نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور اسے شانوں پر اٹھا کر ناچنے لگا۔ ایلی نے شور مچایا۔ ٹانگیں چلائیں۔ لیکن بے کار۔ اللہ داد نے اسے اٹھائے رکھا ''شفیع او شفیع اب بن گئی بات۔ اب تو وہ باؤنڈری لگائیں گے کہ یہ مہاشے یاد کریں گے۔'' شفیع کو تلاش کرنے کے بعد وہ دونوں ویسے ہی ایلی کو اٹھائے ہوئے جلوس کی صورت میں ہر کمرے میں گھومنے لگے۔

''لو بھئی ہو جاؤ تیار ہرنام سیاں اور گوبند رام ذرا آ جاؤ میدان میں ہمارا پٹھو بھی پہنچ گیا ہے وہ باؤنڈری لگے گی کہ یاد رکھو گے۔''

ہرنام سنگھ نے انہیں دیکھ کر مونچھ مروڑی ''واہ گرو۔'' وہ دھاڑنے لگا۔ ''وہ ہتھ دکھاؤں گا کہ یاد کرو گے.....''

اللہ داد نے طنز بھرا قہقہہ لگایا۔ ''تو آ جاؤ میدان میں میرے یار۔''

پھر وہ رام گوپال کے کمرے میں جا گھسے ''نکل آ بے رامو۔'' اللہ داد چلایا۔ ''دیکھیں گے آج تیرے ہاتھ ابے مسلوں کے سامنے کیا ٹھہرو گے تم۔ آدم خور ہوتے ہیں ہاں۔''

رام گوپال نے ایک نعرہ لگایا جے کالی ماتا جے بجرنگ بلی اور چھلانگ مار کر باہر نکل آیا۔

یونہی جلوس بڑھتا گیا۔ وہ ہر کمرے میں داخل ہوتے اور پھر باہر نکل کر نعرے لگاتے اور لڑکوں کو نکال کر آگے چل پڑتے۔ سب سے آخر میں وہ بنگالی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں پہنچے۔

''علی.....مولا علی۔'' اللہ داد نے نعرہ لگایا۔ بنگالی بابو گھبرا کر باہر نکل آیا اور لڑکوں کے جلوس کو دیکھ کر اس کی گھبراہٹ نے مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی۔

''ارے یہ کیا گڑبڑ ہے بھئی۔'' بنگالی بولا۔

''باہر نکلئے صاحب۔'' لڑکے ایک زبان ہو کر چلائے وقت ہو چکا ہے وہ مقابلہ

ہوگا آج کہ رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔"

"وہ ہاتھ دکھاؤں گا صاحب کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔" رام گوپال چلایا۔

"واہ گرو۔" ہرنام سنگھ کی آواز گونجی۔

"علی۔ حیدر" اللہ داد چیخنے لگا۔

"شور نہ مچاؤ۔" بنگالی بابو مسکرانے لگا۔ "چلو ہم آتا ہے۔" لڑکے جانے لگے تو اس نے انہیں روک لیا۔

"ٹھہرو۔"

"ہاں بھئی۔" بنگالی سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ "تم سب کو رولوں کا کھبر ہے۔"

"مسلمانوں کو گوشت منگانے کی اجازت دی جائے۔" شفیع بولا۔

"نو۔ نو۔ نہیں نہیں۔" چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ "نہیں نہیں۔" سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ اس کی اجازت نہیں ہو سکتی۔"

"کچھ پروا نہیں۔" اللہ داد بولا۔ "لیکن ہم تین مسلمان ہیں۔ ہم مل کر مقابلہ کریں گے۔ ہمارا حساب اکٹھا رکھا جائے۔ بعد میں تین پر تقسیم کر دیا جائے۔"

"نو۔ نو۔" لڑکے چلائے۔

"اس میں کوئی حرج نہیں۔" سپرنٹنڈنٹ بولا۔ "ہرے۔ ہرے۔" شفیع اور اللہ داد چیخنے لگے۔

"آدھ گھنٹے کے بعد مقابلہ شروع ہو جائے گا اب تیاری شروع کرو۔" بنگالی بابو نے کہا۔

مقابلہ

سپرنٹنڈنٹ کی اس بات پر نعروں اور چنگھاڑوں کے بعد جلوس بکھر گیا۔ اللہ داد ایلی کو شانوں پر اٹھائے ہوئے اپنے کمرے میں آیا۔

"ابے کیسا مقابلہ ہوگا۔ مجھے بتاؤ تو سہی۔" ایلی نے اللہ داد سے پوچھا۔

''ہائیں تمہیں معلوم نہیں کیا۔'' اللہ داد نے غصے میں دھم سے ایلی کو چارپائی پر پھینک کر پوچھا۔

''ارے بدھو آج مسلمانوں کے امتحان کا دن ہے۔ آج انہیں کفار کو نیچا دکھانا ہے۔ بیٹا آج تمہیں ہماری لاج رکھنی ہے۔ اگر مسلمانوں کے ہوتے ہوئے ''پیٹو'' کا خطاب کسی اور کو مل گیا تو بھئی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔'' اللہ داد بولا۔

''اتنا کھاؤ آج۔ اتنا کھاؤ کہ اس اسلامی پیٹ کے صحرا میں بندو کے پھلکے ریت کے ذرے بن جائیں۔'' شفیع نے اپنا ادبی انداز دکھایا۔

''ارے چھوڑو یہ صحرا وحرا۔'' اللہ داد بولا۔ ''یوں کہو کہ اتنا کھاؤ اتنا کھاؤ کہ میز سے اٹھانے کے لیے چار آدمی بلانے پڑیں۔ یہ بنگالی بابو کیا یاد کرے گا سالا کہ مسلے کبھی آ کر ٹھہرے تھے بورڈنگ میں۔''

کالج کے بورڈنگ کی رسم کے مطابق ہر سال ایک مرتبہ کھانے کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ شام کے کھانے پر باہر میزیں لگا دی جاتیں۔ تمام امیدوار اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے۔ درمیان میں سپرنٹنڈنٹ کی کرسی رکھ دی جاتی تا کہ وہ فیر اور فاؤل کا فیصلہ کر سکے۔

کچن میں اس روز دو چار اچھے اچھے سالن پکائے جاتے۔ اتنی مقدار میں پکائے جاتے کہ امیدواروں کے لئے کافی ہوں کیونکہ مقابلے کے روز ہر امیدوار کوئی سا سالن طلب کر سکتا تھا۔ جب مقابلہ شروع ہو جاتا تو ہر امیدوار کے پاس دو ریفری کھڑے ہو جاتے جو پھلکوں کی تعداد گنتے جاتے اور ہر نئے پھلکے پر آواز دیتے۔ ''رام گوپال بارہواں۔'' ''لینا سیاں پندرہواں۔'' اور درمیان میں بیٹھے ہوئے منشی ہر امیدوار کے نام کے سامنے تعداد لکھتے جاتے۔ ان ریفریوں کے ساتھ مختلف پارٹیوں کے لڑکے کھڑے رہتے تا کہ تعداد لکھنے والے شرارت نہ کریں اور ہر بے

ضابطی پر سپرنٹنڈنٹ کو پکارا جاتا۔ ''پوائنٹ آف شکایت لالہ جی۔'' جولڑکا اس مقابلے میں سب سے زیادہ پھلکے کھاتا اسے ''پیٹو'' کا خطاب دیا جاتا اور گلے میں ہار ڈال کر اس کا جلوس نکالا جاتا۔ جس کے ساتھ مناسب قسم کے نعرے لگائے جاتے۔

مقابلے کے دن کے لئے باورچی بندو پہلے ہی پھلکے پکا رکھتا تا کہ پھلکوں کی کمی کی وجہ سے میچ میں خلل نہ پڑ جائے پھر مقابلے کے وقت بندو، رامو، ہرنامہ اور کرشا رسوئی میں بیٹھ کر پکے ہوئے پھلکے سینکنے میں مصروف ہو جاتے اور رامو۔ کھمیا اور بڈھا چوکیدار باہر میزوں پر چیزیں مہیا کرنے کے لئے تیار رہتے۔

مقابلہ شروع ہوا۔ رسوئی کی کھڑکیوں اور دروازوں سے پھلکوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی اور ایلی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے رسوئی اور میزوں کے درمیان سفید کبوتر اڑ رہے ہوں۔ ''بندو پھلکا'' ہرنام سنگھ چیختا۔ ''آٹھ'' اس کے سر پر کھڑا ریفری چلاتا اور پھر ادھر سے رام گوپال شور مچا دیتا۔ ''بندو ادھر، پندرہ، بندو ''پھلکی'' اللہ داد چیختا ساتھ ہی شفیع اور ایلی چیخنے لگتے۔ ''پھلکاری پھلکاری۔'' ''ستاسٹھ۔ستاسٹھ۔'' کی آواز سن کر روم گوپال چونک جاتا۔ ارے پھر دفعتاً اسے یاد آتا کہ اللہ داد شفیع اور ایلی کے پھلکوں کا حساب اکٹھا ہو رہا ہے۔ اور ستاسٹھ کا مطلب تھا ستاسٹھ بٹا تین یعنی بائیس فی کس۔ اسی قسم کی چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ چاروں طرف سے شاباش رام گوپال اشکے اوئے ہرنامے۔ علی حیدر کے نعرے گونج رہے تھے اور ہر لحظہ سکور بڑھتا جا رہا تھا۔ مقابلے میں صرف سات امیدوار تھے۔ رام گوپال، ہرنام سنگھ، امرت لال، گوچرن سنگھ، ان کے علاوہ مسلمانوں کا ایک گروپ تھا۔ جس میں اللہ داد شفیع اور ایلی تھے۔ صحن میں پانچ چھ میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ہر میز پر امیدواروں کے سروں پر ریفری اور لڑکے کھڑے گنتی میں مشغول تھے۔ درمیان میں چھ لڑکے سکورر کی حیثیت سے حساب کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ جن کے پاس ہی آرام کرسی پر بنگالی بابو سپرنٹنڈنٹ جج کی حیثیت سے بیٹھے تھے۔

تین پیٹو

''ایک سوستاون۔''مسلمانوں کے گروپ کے ریفری نے آواز دی۔

''علی حیدر۔''اللہ داد چلایا۔''بندو چٹنی۔''

''پوائنٹ آف آرڈر۔''رام گوپال کھڑا ہو گیا۔''سپرنٹنڈنٹ صاحب اللہ داد صرف چٹنی کھا رہا ہے۔''

''علی حیدر۔''اللہ داد دہاڑنے لگا۔چاروں طرف شور مچ گیا۔

''ٹھہرو،ٹھہرو۔''بینر جی بولے۔''چٹنی پر کوئی پابندی نہیں۔''

''علی حیدر۔''اللہ داد غرایا اور رام گوپال میز سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔اس کے جانے کے بعد شفیع اور اللہ داد دیر تک چنگھاڑتے رہے پھر آہستہ آہستہ گوچرن نے بھی ہاتھ روک لیا اور سب سے آخر میں ہرنام سنگھ کی طبیعت مالش کرنے لگی۔''علی حیدر۔''تینوں مسلمان ہیرو ایک سوستاون پر اٹھ بیٹھے اور بورڈنگ والوں پر گویا اوس پڑ گئی۔

''اجی یہ فاؤل ہے یہ مسلے چٹنی سے روٹی کھاتے رہے ہیں یہ اصول کے خلاف ہے''لیکن ان کی ہر بات پر اللہ داد''علی حیدر''کا نعرہ لگا کر ان کا منہ چڑاتا اور بینر جی مسکرا کر کہتے۔''چٹنی کھانا اصولوں کے خلاف نہیں۔''اور اللہ داد پھر سے تازہ دم ہو کر چنگھاڑتا۔''علی حیدر۔''

پیٹو کا لقب تو انہوں نے حاصل کر لیا۔لیکن رات بھر ان تینوں کی بری حالت رہی۔چارپائیوں پر پڑے وہ دیر تک کروٹیں بدلتے رہے اور پھر اللہ داد اٹھ بیٹھا اور کان پر ہاتھ رکھ کر گانے لگا اور پھر دفعتاً چلا کر بولا۔

''ارے یارو۔کیوں اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔نیند تو آج تمہارے باپ کو بھی نہیں آئے گی۔بیکار پڑے ہو۔آؤ چلو امرودوں کے باغ سے امرود توڑ کر لائیں۔بڑے ہاضم ہوتے ہیں۔تمہاری قسم۔''

صبح سویرے اللہ داد نے پرنسپل کے نام ایک درخواست لکھی کہ حضور چھٹی لینے کا نہ تو ہمارا ارادہ ہے۔ اور نہ چھٹی میں کوئی دلچسپی ہے ازراہ کرم چار آدمی بھیج دیجئے جو ہمیں اٹھا کر کالج لے آئیں۔

دوپہر کے وقت پرنسپل اپنی لینڈ و میں آیا اس کے ساتھ آصف تھا ''ہیلو'' پرنسپل بولا۔ ''مبارک ہو تمہیں۔ پیٹو بولو کیا حال چال ہے تمہارا۔'' اللہ داد نے اٹھ کر ہاتھ جوڑے ''حضور آپ کا دیا سب کچھ ہے صرف اتنی ارج ہے کہ چار دن کے لئے چار آدمی مقرر کر دیئے جائیں جو ہمیں اٹھا کر گھما پھرا لایا کریں۔'' پرنسپل نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر ''شاباش ویل ڈن'' کہتا ہوا رخصت ہو گیا۔

اداس شام

پرنسپل کے جانے کے بعد آصف نے ایلی کو اشارہ کیا۔ ذرا یہاں تک چلنا میرے ساتھ۔ اس وقت اللہ داد اور شفیع اپنی ہی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے ایلی چپکے سے آصف کے ساتھ چل پڑا۔ آصف کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو تھی مگر مسکراہٹ میں تازگی نہ تھی۔ اسے ملتے ہی ایلی نے ایک سانس میں کئی ایک سوال کر ڈالے۔

''کل تم کیوں نہ آئے وہ کون تھی جس نے ڈبل اینٹ ماری تھی۔ وہ تمہیں گھورتی کیوں تھی۔ تم سہمے ہوئے کیوں ہو۔ کیا ہے تمہیں آصف بولو بھی نا۔''

لیکن آصف چپ چاپ کھڑا تھا اس کے ہونٹوں پر کھسیانی مسکراہٹ تھی اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔

پھر ایلی بھی خاموش ہو گیا اور دیر تک وہ دونوں درخت تلے خاموش بیٹھے رہے۔ ہر چند منٹ کے بعد آصف ایلی کی طرف دیکھ کر بے بسی بھرے انداز سے مسکرا دیتا۔

آخر وہ بولا۔ کہنے لگا۔ ''ایلی اگر میں زہر کھا لوں تو تم برا تو نہ مانو گے۔''

''زہر۔'' ایلی نے پوچھا۔ ''آخر کیوں؟''

''یہ نہ پوچھو۔'' آصف نے کہا۔ ''اب زندگی بیکار ہے۔ بے عزتی کی زندگی سے مر جانا بہتر ہے۔''

''اگر میں کہوں کھالو تو کیا کھالوگے تم۔'' ایلی نے شرارت سے پوچھا۔ ''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''کھالوں گا۔''

ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ آصف چپ چاپ نہر کے پانی کو گھورنے لگا۔ دور کوئی رہٹ رو رہا تھا۔ سامنے ندی کا پانی گویا چلتے چلتے رک گیا تھا۔ اردگرد پھیلے ہوئے کھیتوں میں پودے سر جھکائے کھڑے تھے اور وہ دونوں ہی خاموش بیٹھے تھے۔

وہ یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ حتیٰ کہ سورج مغرب میں جا ڈوبا اور آسمان پر سرخ دریاں پھیل گئیں اور رہٹ رو رو کر چپ ہو گیا۔ کتنی اداس شام تھی وہ۔

ایلی اٹھ بیٹھا۔ ''نہیں۔'' وہ بولا۔ ''ابھی تم زہر نہ کھاؤ۔''

''کیوں۔'' آصف نے پوچھا۔ ''کیوں نہ کھاؤں۔''

''بس ابھی نہیں کہہ جو دیا ہے میں نے۔''

''اچھا۔'' آصف نے آہ بھری۔ ''پھر میں کیا کروں۔''

''انتظار کرو۔'' ایلی بولا۔

اچھا کہہ کر آصف خاموش ہو گیا اور پھر بورڈنگ میں جانے کی بجائے شہر کو چل پڑا ''میں اب چلتا ہوں۔''

''اچھا۔'' ایلی بولا ''کل پھر ملیں گے۔''

ساری رات ایلی سوچتا رہا کہ آصف زہر کھانے پر کیوں آمادہ تھا وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے دکھی تھا۔ وہ لڑکی کون تھی وہ چلا کیوں رہی تھی اس روز آصف کو اس سے محبت تھی۔ پھر اس نے آصف کی بیٹھک پر اینٹ کیوں پھینکی تھی اور چلا کر کیوں کہا تھا۔ سامنے بلاؤ اسے اگر انہیں محبت تھی تو۔ لیکن محبت ایسے تو نہیں کی جاتی

محبت تھی تو پھر زہر کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ انہیں خیالات میں کھویا ہوا وہ سوچتے سوچتے سو گیا۔

آصف

آصف ایک خاموش اور شرمیلا نوجوان تھا۔ نہ جانے اس کی بے پناہ جاذبیت کا کیا راز تھا۔ شاید اس کی وجہ اس کی خاموشی اور شرمیلا پن ہو یا شاید اس کا سفید رنگ جھکی جھکی آنکھیں اور رخساروں پر جھلکتی ہوئی سرخی کو اس سے کوئی تعلق ہو بہر صورت یہ امر مسلمہ ہے کہ محلے کی لڑکیاں اس کی لئے بے قرار رہتی تھیں۔ قرب و جوار میں رہنے والیاں بار بار کوٹھے پر چڑھتیں کہ شاید ایک نظر آصف کو دیکھنا نصیب ہو جائے۔ کئی ایک تو گھنٹوں کوٹھے پر ٹہلتی رہتیں یا جب کالج جانے یا وہاں سے لوٹنے کا وقت ہوتا تو وہ گلی کی کھڑکیوں میں آ کھڑی ہوتیں۔ کئی ایک اسے چھپ کر دیکھتیں۔ کئی ایک ایسی بھی تھیں جو بے پروائی کے پردے میں اپنی نمائش کرتیں کہ ایک نظر آصف انہیں دیکھ لے اور چند ایک تو دیوانہ وار چقیں اٹھا لیتیں یا کھڑکیوں سے لٹکتیں شوخ لڑکیوں نے کئی بار اعلانیہ طور پر اسے سلام بھی کئے تھے۔ اس کے علاوہ اعلانیہ بات بھی کی تھی۔ مگر گلی میں چلتے ہوئے آصف نے کبھی گردن نہ اٹھائی تھی۔ وہ چپ چاپ زمین پر نظریں گاڑے جلدی جلدی گلی میں سے گزر جانے کی کوشش کرتا تھا۔

کوٹھے پر اس کا رویہ مختلف ہوتا تھا وہ اوپر چڑھتے ہی نیچی نظر سے چھتوں کا جائزہ لیتا اگر کوئی بزرگ صورت مرد یا عورت قرب و جوار میں نہ ہوتے تو وہ لڑکی پر بھرپور نظر ڈالتا اور پھر چپکے سے سامنے سے ہٹ جاتا غالباً اس کی یہ بھرپور نظر اس کی تمام تر مشکلات کی وجہ تھی۔

اسے لڑکیوں سے دلچسپی ضرور تھی۔ لیکن اسے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ والدین کیا سمجھیں گے نہ جانے والدین کو خوش کرنے کے لئے یا اپنے

زہد وتقویٰ کا رعب جمانے کے لیے۔ یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ وہ اپنی برتری کا عملی طور پر اظہار کرنا چاہتا ہو۔ چاہے اس کی وجہ کچھ بھی ہو وہ اکثر کوٹھے سے اتر کر ماں کی طرف جاتا اور کسی نہ کسی لڑکی کی شکایت کرتا۔ ''دیکھ لو اماں آج اس نے مجھے سلام کیا ہے۔'' اور اس کی ماں نہ جانے کس غلط فہمی یا حماقت کی وجہ سے جھٹ نوکر کو بھیج کر لڑکی کے والدین تک شکایت پہنچا دیتی۔

ایسی شکایت محلے کی کئی ایک لڑکیوں کے والدین تک پہنچ چکی تھی اور وہ سب آصف کی اس عادت سے نالاں تھیں۔ والدین تو پہلے ہی اپنی بچیوں کی معصومیت پر یقین رکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی اپنی اولاد بے حد معصوم اور پاکباز ہے البتہ دوسروں کے بچے انہیں گمراہی کی طرف راغب کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ آصف کی ان شکایات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکیوں نے آنسو بہا بہا کر والدین کو یقین دلا دیا کہ ان کا کوئی قصور نہیں اور محلے والوں کے دلوں میں آصف کے خلاف بغض پیدا ہو گیا۔

اگلے روز جب وہ کالج میں ملے تو آصف کے چہرے پر حقیقی انبساط کی جھلک تھی اور اس کے تبسم میں شگفتگی تھی۔ ایلی کو دیکھ کر وہ حسب معمول اس کی طرف بڑھا اور ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''تسلیم۔'' ایک ہی نظر میں ایلی کو محسوس ہو گیا کہ یہ آصف کل والا آصف نہیں تھا وہ آصف جو تین گھنٹے یوں چپ چاپ بیٹھا رہا تھا جیسے پتھر کا بنا ہو۔

''زہر تو نہیں کھا لیا تم نے۔'' ایلی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ بولا۔ ''تم نے جو کہا تھا انتظار کرو۔''

''تو انتظار کر رہے ہو۔'' ایلی نے اسے چھیڑا۔

''نہیں۔'' وہ بولا۔ ''اب اس کی ضرورت نہیں۔ آؤ ادھر تنہائی میں گھومیں یہاں لڑکے آ جاتے ہیں۔ اکیلے میں بتاؤں گا تمہیں۔'' اور وہ دونوں میدان کی طرف نکل

گئے۔

سفینہ

آصف نے بات شروع کی۔ ''اس لڑکی نے مجھے بہت تنگ کیا ہے ایلی۔''

آصف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''وہی جو اس روز مقابل کے چوبارے میں کھڑی تھی۔ جس روز تم آئے تھے۔ جس نے روشن دان پر اینٹ پھینکی تھی۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ ایلی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح کوٹھے پر چڑھ کر ہمارے گھر کی طرف جھانکا کرتی تھی۔ میں نے دو ایک مرتبہ اماں کی معرفت شکایت بھی بھجوائی۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ الٹا اس نے گھنٹوں اعلانیہ کوٹھے پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ سارا دن کوٹھے پر دھوپ میں کھڑی رہتی۔

خیر وہ دن بھی گزر گئے پھر گرمیاں آئیں تو ہم کوٹھے پر سونے لگے۔ ان کے کوٹھے پر ہماری طرح پردے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ صبح سویرے وہ اٹھ بیٹھتی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہمارے کوٹھے کی طرف منہ کر کے بیٹھ رہتی۔ جب تک میں نہ جاگتا وہ اسی طرح بیٹھی رہتی پھر جب میں بیدار ہو جاتا تو وہ منہ سے ہاتھ ہٹاتی اور مجھے سلام کر کے مسکراتی۔ ایسے معلوم ہوتا جیسے اس نے صبح سویرے مجھے دیکھنے اور سلام کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ مجھے دیکھنے سے پہلے وہ منہ سے ہاتھ نہ ہٹاتی تا کہ کوئی اور اس کے روبرو نہ آئے۔ گھر والوں نے اس بات پر اسے مارا پیٹا۔ مگر اپنی ہٹ سے باز نہ آئی۔ آخر گھر والے ہار گئے۔

اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میرے تو اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ محلے والے کیا کہیں گے۔ میں سوچتا رہتا۔ محلے کے لوگوں کو دیکھ کر سر جھکا لیتا۔ مجھے شرم محسوس ہوتی۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ مجھ پر ہنس رہے ہوں۔ میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ لیکن اب۔ اب نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ گویا وہ اپنے بس میں نہیں رہی اب اسے ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے یا وہ پاگل ہو چکی ہے۔ چند ایک دن سے اس کی آنکھیں سرخ ہیں۔

منہ سوجا ہوا ہے اور اسے قطعی پروا نہیں کہ وہ کیا کر رہی ہے اسے کسی بڑے چھوٹے کی پروا نہیں۔ وہ کوٹھے پر چڑھ کر با آواز بلند میرا نام لے لے کر پکارتی ہے۔ آوازیں دیتی ہے۔ آصف آصف جی۔ لوگ سن کر ہنستے ہیں۔ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ پھر وہ مقابل کے چوبارے میں آجاتی ہے اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر با آواز بلند باتیں کرتی ہے۔ اگر میں سامنے نہ جاؤں تو پتھر پھینکتی ہے۔" آصف نے آہ بھری اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ خاموش ہو گیا۔ ایلی یہ روئیداد سن کر خوشی کی ایک لہر محسوس کر رہا تھا۔ کتنا خوش نصیب ہے اف۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جسے کسی کی محبت حاصل ہے۔ جسے دیکھنے کے لئے کوئی منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آصف اس بات پر آبدیدہ کیوں ہو رہا تھا۔ اس بات پر زہر کھانے کا مطلب۔

"اور.....اور۔" آصف نے پھر بات شروع کی۔ "اس نے اپنا نام بھی بدل لیا ہے۔ اب وہ سفینہ کی بجائے اپنے آپ کو آصفہ کہتی ہے۔ آصفہ توبہ کتنی جرات ہے۔ لیکن اب وہ چلی گئی ہے۔" آصف نے کہا۔ "اس کے والدین زبردستی اسے لے گئے ہیں۔ نہ جانے کہاں۔ تاکہ بدنامی نہ ہو۔ اللہ کرے وہ کبھی واپس نہ آئے۔"

"کیا واقعی اسے تم سے محبت ہے۔" ایلی نے حسرت ناک انداز سے پوچھا۔

آصف ہنسنے لگا۔ "مجھے کیا معلوم۔" وہ بولا کہ محبت کیا ہوتی ہے اگر یہی محبت ہے تو اللہ بچائے توبہ کتنی بدنامی ہوئی ہے۔ کتنی رسوائی۔ "کیا تمہیں بھی اس کا خیال ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ متبسم نگاہوں سے ایلی کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں تسخیر کی مسرت تھی۔

"کیا وہ خوبصورت ہے آصف؟" ایلی نے پوچھا۔

"خوبصورت" آصف سوچنے لگا اور پھر ہنس کر بولا۔ "یہ سبھی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔"

اس روز ایلی آصف کی باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ کس قدر عجیب باتیں تھیں آصف کی۔ شریف سے کس قدر مختلف۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر محبت کے متعلق ہر ایک کا نظریہ مختلف کیوں تھا اور محبت کی حقیقت کیا تھا۔ وہ تو اس بات پر فخر کیا کرتا تھا کہ اسے تسلیم سے محبت ہے اور محلے والوں کے سامنے اسے تسلیم کرنے میں ذرا نہ ہچکچاتا تھا۔ لیکن آصف۔

دن بھر ایلی بورڈنگ میں بیٹھے ہوئے سوچتا رہا۔ اس کے سر پر آموں کے درختوں کی ٹہنیاں ہوا میں جھولتی رہیں۔ کھیت گویا بال پھیلائے سوگ مناتے رہے اور دور ریہٹ کراہتا رہا۔ یونہی دوپہر سے شام ہوگئی اور مغرب میں بادل کسی ان جانے غم سے سلگنے لگے۔ آگ کے شعلے لپکنے لگے۔ ایک اضطراب۔ دکھ بھری بے قراری۔ خاموش غم فضا سے چھنتا رہا۔

بادلوں کے ان ٹکڑوں میں تسلیم اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی لٹیں الجھی ہوئی تھیں۔ پھر دفعتاً ایک حرکت سی ہوئی اور تسلیم نے گول مٹول صورت اختیار کر لی۔ جیسے گٹھڑی ہو۔ پھر سبز گٹھڑی کے پٹ کھل گئے اور چھم سے کسی نے جھانکا۔ ''مجھے تم سے ڈر آتا ہے ایلی۔'' ایک متبسم آواز سنائی دی اور پٹ پھر سے بند ہو گئے۔ وہ چونک پڑا۔ توبہ ہے۔ وہ زیر لب بولا اور کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جلد ہی ایک بدلی نے کرشن کنہیا کا روپ دھار لیا۔ ٹک ٹک ٹک قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ دو بڑی بڑی سیاہ کشتیاں ڈول رہی تھیں۔ دور کوئی بانسری بجا رہا تھا۔ کتنی اداس تھی۔ وہ شام۔ اداس اور خاموش۔

پگلی بہن

اگلے روز تسلیم کے گھر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا اگر تسلیم کو بھی کچھ ہو جائے جیسے آصفہ کو ہوا تھا اور وہ کھڑکی سے چق اٹھا کر سامنے آ کھڑی ہو جیسے اس روز آصفہ کھڑی تھی اور پھر اسی طرح کہے ''تم سامنے کیوں نہیں آتے'' تو کیا زندگی بن

جائے۔ یا جب وہ وہاں پہنچے تو تسلیم آنکھوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہو اور اسے دیکھ کر ہاتھ اٹھا کر مسکرائے۔ ''سلام'' اور پھر ہنس کر اندر بھاگ جائے۔ صرف ایک مرتبہ صرف ایک بار۔ روزنہ سہی صرف ایک بار۔ صرف ایک بار صرف ایک بار کا ورد کرتا ہوا وہ ان کے گھر پہنچ گیا اور وہاں پہنچ کر دفعتاً اسے خیال ہوا کہ وہ منزل پر پہنچ چکا ہے۔ مگر منزل ویران پڑی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں سیڑھیاں خالی تھیں۔ دیر تک وہ وہاں کھڑا مایوس و محروم نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا جی چاہا کہ چپکے سے لوٹ آئے اور نہر والی کوٹھی میں آموں کے درختوں تلے بیٹھ کر جی بھر کر روئے۔ روتا رہے حتیٰ کہ اس کے جسم کے بند بند میں وہ چلچلاتا ہوا درد ختم ہو جائے جو ان دنوں وہ محسوس کرنے لگا تھا۔

''ہائیں۔ تم ہو ایلی۔'' حمیٰ اسے دیکھ کر چلایا۔ ''یہ کیا صورت بنا رکھی ہے۔ جیسے پٹ کے آئے ہو۔ آؤ۔ آؤ۔ تمہارا دل بہلاؤں۔ اس کے پاس جا کر سب دکھ بھول جاتے ہیں۔ نہیں نہیں گھبراؤ نہیں۔ اس کے یہاں کوئی نہیں آتا جاتا۔ اس نے دھندہ چھوڑ رکھا ہے۔ کیسے کرے دھندہ۔ ہمارے عشق میں مری جا رہی ہے اور ایلی ایمان سے وہ تو ازلی طور پر گھریلو عورت ہے خالص پدمنی۔ اس کے پاس بیٹھ کر ایسے محسوس کرتا ہوں۔ جیسے ماں کی گود میں بیٹھا ہوں اتنا آرام و سکون ملتا ہے وہاں، آؤ۔ آؤ لے چلوں تمہیں۔''

''آہا ایلی۔'' آغا بال بناتا ہوا باہر نکلا۔ ''بھئی اب تو آتے ہی نہیں تم اس طرف۔ کون سے نئے مشاغل پیدا کر لئے ہیں اور وہاں.....''

''کیوں ایلی چلو گے؟'' حمیٰ نے آغا کی بات کو کاٹ کر کہا۔

''نہ۔ نہ بھئی۔'' آغا نے حمیٰ سے کہا۔ ''اس پر تو کرم ہی کر۔'' اس پر حمیٰ منہ بنا کر چل پڑا اور ایلی آغا کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ حمیٰ اسے وہاں لے جائے جہاں ماں کی آغوش کا سا سکون میسر ہوتا ہے۔ جہاں وہ ہو جو محبت کے

لئے دھندہ چھوڑنے کی جرات رکھتی ہے۔ جو روپوں کی جھنکار کو محبت پر قربان کر سکتی ہے۔

''کس سوچ میں کھوئے ہوئے آج؟'' آغا بولا۔ ''بہت اداس ہو۔''

جواب میں ایلی ہنس دیا۔ ''نہیں تو اداس تو نہیں۔'' اس نے آہ بھر کر کہا۔

''تو کوئی بات سناؤ۔'' آغا نے کہا۔

''کوئی بات ہو بھی۔''

''اوہ۔'' آغا مسکرا دیا اور پھر دانت صاف کرنے لگا۔

ایلی نے چوری چوری اوپر کی طرف نظر دوڑائی مگر وہاں کوئی پلو دکھائی نہ دے رہا تھا۔ نہ جانے اس قدر خاموشی کیوں چھائی ہوئی تھی۔

''حیٰ کی بات سنی تم نے؟'' آغا نے بات شروع کی ''حد ہو گئی اس کا نام الماس ہے۔ نئی نئی آئی ہے۔ یہاں اچھی خاصی ہے۔ نوجوان ہے۔ نہ جانے حیٰ نے کیا کر دیا ہے۔ بیچاری نے دھندہ چھوڑ رکھا ہے۔ اس کے جواری میراثی بھوکے مر رہے ہیں اور حیٰ کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ کسی سے ڈرے۔ توبہ کرو۔ ڈر تو اس کی گھٹی ہی میں نہیں۔ سارا دن وہاں جا کر بیٹھ رہتا ہے۔ وہ اس کی جرابیں دھوتی ہے پتلونیں استری کرتی ہے۔ چائے بنا بنا کر پلاتی ہے۔ عجیب جذبہ ہے محبت کا۔''

آغا ہنسنے لگا۔ دھندہ کرنے والیوں کو بھی نہیں چھوڑتا۔ کوئی معصوم نہیں ہے وہ اناڑی نہیں۔ سب کچھ سمجھتی ہے۔ جانتی ہے کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ حیٰ محض وقت کٹی کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ فریب کھائے جاتی ہے۔ عجیب بات ہے۔'' آغا ہنسنے لگا۔ ''آؤ آج تمہیں سیر کرا لائیں، آؤ۔''

جب وہ چلنے لگے تو دفعتاً اوپر سے نیم کی آواز آئی۔ ''بھائی جان میں آ رہی ہوں۔''

''تو پھر میں کیا کروں۔'' آغا نے ہنس کر کہا۔

''میں آ جو رہی ہوں۔'' وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔

''خواہ مخواہ۔ مجھ سے کام ہے کیا۔''

''نہیں تو۔'' وہ دروازے میں کھڑی ہوگئی۔

''تو پھر میں کیا کروں۔''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ ہنسنے لگی۔

''تو پھر چلا کیوں رہی تھی تو۔''

''بس چلا رہی تھی۔ یونہی۔''

''اچھا شور نہ مچا ہم جا رہے ہیں۔ آ وا ایلی۔''

آغا بات کر رہا تھا تو چھوٹی نیم اس کی پشت کے پیچھے سے یوں ہونٹ ہلا رہی تھی جیسے کچھ کہہ رہی ہو جیسے کوئی پیغام دے رہی ہو۔ لیکن ایلی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

جب آغا چلنے لگا تو وہ پھر چلائی۔ ''کہتی ہوں کوٹھے پر بلا رہے ہیں آپ کو۔''

''بلا رہے ہیں کیوں۔''

''کیا معلوم۔'' وہ پھر ہونٹ ہلا کر ایلی کو اشارہ کرنے لگی۔

''اس وقت نہیں۔ ہم جا رہے ہیں۔'' آغا نے گھور کر کہا۔

''اچھا تو اچھے بھائی جان ہمیں ایک پان لے دو۔''

''اوہ..... تو یہ بات ہے۔'' آغا ہنسنے لگا۔ ''خود لے لینا یہ لو پیسے۔''

''ہم تو پان لیں گے پیسے نہیں۔'' وہ لاڈ سے بولی۔

''پاگل ہوگئی ہے کیا۔'' آغا ہنسا۔

''ہاں۔'' نیم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''پاگل ہوگئی ہوں۔''

آغا قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ''یہ بہنیں بھی بہت مہنگی پڑتی ہیں۔ اچھا میں لاتا ہوں پان۔ تو اب بھاگ نہ جائیو۔''

''نہیں بھاگتی۔'' وہ مسکرائی۔

آغا باہر نکلا تو وہ ایلی کے قریب تر ہو کر بولی۔ ''اپنا بائیسکل نہ لے جانا یہیں چھوڑ جانا اور کل شام کو تین بجے آ کر کہنا بائیسکل دو۔'' اس نے ایلی کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے وہ ایک بچہ ہو۔ اس روز پہلے دن ایلی نے محسوس کیا کہ وہ ننھی سی معصوم بچی ایک مکمل عورت تھی جس کے پلو میں کئی آغوش مادر چھپی ہوئی تھیں۔ یہ کہہ کر وہ اوپر کی طرف بھاگی۔

''ہائیں۔'' ایلی چلایا۔ ''اور وہ پان۔''

''پان۔'' وہ ہنسی۔ ''میں نہیں کھاتی پان وان۔ نہ بھئی۔''

عین اس وقت آغا داخل ہوا۔ ''ہائیں چلی گئی اور یہ پان۔'' اس نے پھر قہقہہ لگایا۔ ''ہی ہی ہی۔ یہ بہنیں بالکل ہی پگلی ہوتی ہیں۔'' اور وہ پان منہ میں ڈال کر ہنسنے لگا۔

''سائیکل لے لو چلیں۔'' آغا نے ایلی سے کہا۔

''نہیں۔'' ایلی نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہاں ہی پڑا رہے گا کل لے لوں گا کسی وقت....'' ''اچھا یوں ہی سہی۔'' آغا نے بے پرواہی سے کہا اور وہ دونوں چل پڑے۔

اتنی ساری

اس روز جب ایلی بورڈنگ پہنچا تو وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ کئی ایک دنوں سے ایک بے نام سا درد اس کے بند بند میں چیونٹیوں کی طرح رینگ رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے اس کا وجود ایک تکلیف دہ چیز ہو۔ اس کے گرد نیلا آسمان روز بروز پھیکا پڑتا جاتا تھا اور دنیا یوں دکھائی دینے لگی تھی جیسے ایک ویرانہ ہو۔ طویل و عریض ویرانہ۔ بے مقصد پھیلاؤ۔ ایک اذیت دہ ٹھہراؤ چاروں طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس صحرا میں وہ خود ایک ناؤ تھا۔ جس کے گرد ریت کی لہریں بھتنوں کی طرح ناچ رہی تھیں۔

جب بھی ایلی کی توجہ اپنی جانب مبذول ہوتی تو وہ اس ٹھہراؤ کو شدت سے محسوس کرتا لیکن جب اس کی توجہ ریت کی لہروں کی طرف منعطف ہوتی تو اسے حرکت کا احساس ہوتا۔ جب وہ بستر پر لیٹا تو اس کا خیال نیم کے پیغام پر مرکوز ہو گیا۔ نہ جانے نیم کا مطلب کیا تھا۔ مطلب تھا بھی یا محض تفریح یا کچھ اور پھر بائیسکل رکھنے سے کیا مقصد ہو سکتا ہے اور اسے واپس لانے کی سکیم سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ دیر تک وہ اس پگلی لڑکی کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ لیکن گتھی نہ کھلی۔ وہ سوچ سوچ کر ہار گیا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔

اگلے روز کئی دفعہ اسے خیال آیا کہ سائیکل وقت مقررہ پر لانے کی آخر کیا ضرورت ہے۔ کسی وقت بھی لے آؤں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر اس کے ذہن میں امید کی ایک کرن روشن ہو جاتی۔ شاید فرق پڑ جائے پھر جلد ہی وہ کرن بجھ جاتی اور گھٹاٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ لیکن اس کشمکش کے باوجود وہ مقررہ وقت پر آغا صاحب کے گھر جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے چوبارے کی کھڑکیوں پر نگاہ دوڑائی۔ سیڑھیوں کی طرف دیکھا مکان گویا ویران پڑا تھا۔ بے دلی سے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہے؟'' بڑھیا نے آواز دی۔

''میں ہوں ایلی۔'' وہ چلایا۔

''کوئی گھر نہیں ہے نہ آغا ہے نہ جمی۔'' بڑھیا نے رونے کے انداز میں کہا۔

''اپنا سائیکل لینے آیا ہوں۔'' وہ بولا۔

''سائیکل؟'' بڑھیا خاموش ہو گئی۔ پھر مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ ''سائیکل ساتھ والے گھر میں کھڑا ہے۔ یہ جو ادھر ہے۔ پنواڑی کے پیچھے والا سمجھ گیا نا۔ لے لے جا کر ادھر سے۔''

یہ انتہا تھی۔ اتنی بے رخی تو اجنبی کے ساتھ بھی نہیں برتی جاتی۔ خیر بڑھیا کی عادت ہی ایسی تھی۔ لیکن وہ نیم کیا ہوئی۔ کم از کم اسے تو موجود رہنا چاہئے تھا، کچھ دیر

تو وہ ڈیوڑھی میں کھڑا سوچتا رہا۔ اس امید پر کہ شاید ابھی دروازہ کھل جائے اور نیم جھانکے۔ لیکن دروازہ بند ہی رہا۔ پھر وہ مایوس ہو گیا۔ اور سوچنے لگا۔ اب کون پتہ لگائے کہ وہ مکان کونسا ہے۔ جس میں بائیسکل پڑا ہے۔ چھوڑو بائیسکل لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ تھکا ہوا ہے اور اتنی دور آموں کی کوٹھی تک واپس پیدل جانا۔ اس خیال پر وہ پنواڑی کی دوکان پر جا کھڑا ہوا۔ ''کیوں صاحب۔'' وہ بولا۔ ''آپ کے پچھلے مکان کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے۔''

''یہ ہے۔'' پنواڑی نے قریب ہی ایک ڈیوڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

''انہوں نے کہا ہے۔ میرا بائیسکل وہاں رکھا ہے۔ اس مکان میں کون رہتا ہے؟'' اس نے پنواڑی سے ملتجیانہ انداز سے پوچھا پنواڑی نے غور سے ایلی کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''کوئی نہیں رہتا خالی پڑا ہے۔''

جھجکتے ہوئے اس نے ڈیوڑھی سے اندر جھانکا۔ اندر کوئی دکھائی نہ دیا۔ آواز تک بھی نہ آ رہی تھی۔ پھر جرات کر کے وہ اندر داخل ہو گیا۔ صحن کے عین درمیان میں سائیکل کھڑا تھا اور مکان ویران پڑا تھا۔

مکان کے درمیان ایک وسیع صحن تھا۔ جس کے اردگرد چاروں طرف دالان بنے ہوئے تھے۔ جن میں بہت سے دروازے اور فراخ کھڑکیاں تھیں۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے سائیکل کی طرف بڑھا اور اسے سٹینڈ سے اتارنے لگا۔ جب وہ اسے گھسیٹنے لگا تو دفعتاً چاروں طرف دالانوں سے کئی ایک جوان لڑکیاں جھانکنے لگیں۔ وہ سب ہنس رہی تھی۔ مسکرا رہی تھیں۔ پھر وہ سب دالانوں سے نکل کر باہر صحن میں آ گئیں اور آن کی آن میں اس صحن میں رنگین آنچل لہرانے لگے۔

بیچارہ

''لے جاؤ بائیسکل'' ایک پتلی لمبی لڑکی آگے بڑھ کر بولی۔

''کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟'' دوسری نے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر اسے ڈانٹا اور پھر

ہنس پڑی۔

''یہ ہے کون؟'' ایک اور چمک کر بولی۔

''پوچھو تیم سے۔'' عقب سے ایک شوخ آواز آئی اور وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

چاروں طرف سے ان لڑکیوں نے گویا ایلی پر یورش کر دی۔ خوشبو کا ایک ریلا آیا کئی ایک اڑتے ہوئے آنچل۔ اس کی طرف لپکے جیسے کالے ناگ زبانیں نکالے جھپٹ رہے ہوں۔ زن سے بالی کا سر جسم سے الگ ہو کر فضا میں اڑا جیسے بارود کا بنا ہوا ہو۔ رنگین خوشبو دار آنچل شعلوں کی طرح اسے چاٹنے لگے۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ آنکھوں تلے دھند چھا گئی۔ گورے چٹے متبسم چہرے۔ سیاہ ڈولتی آنکھیں۔ لہراتی ہوئی چوٹیاں اس سے ٹکرائیں۔ پھر دفعتاً تیم تیم کا شور بلند ہوا اور وہ سب بھاگیں اور ایک مقام پر یوں گڈمڈ ہو گئیں۔ جیسے جمناسٹک گروپ دفعتاً ایک نئی ترتیب میں تشکیل ہو جاتا ہے۔ ''تیم تیم'' وہ کسی پر جھکی ہوئی چلا رہی تھیں۔ پھر وہ کسی کو گھسیٹتی ہوئی ایلی کی طرف بڑھیں اور ایلی رنگین آنچلوں، گوری گوری بانہوں، ریشمی چوڑیوں اڑتی ہوئی خوشبو دار لٹوں اور دلنواز قہقہوں کے انبار میں دب گیا۔

''پکڑ لو۔ پکڑ لو اسے۔'' وہ ایلی کو للکار رہی تھیں۔ ''سنبھالو اپنی پیاری کو اب پکڑ بھی لو نا۔'' کئی ایک گوری بانہیں اس کی طرف لپکیں اور بالآخر دو بازو اس کے ہاتھوں میں تھما دیئے گئے۔ ایک قہقہہ گونجا اور پھر وہ سب ہنستی ہوئی اس زینے کی طرف بھاگیں جو صحن کے ایک کونے سے کوٹھے کی طرف چلا گیا تھا۔ زینے پر رنگین آنچل لہرائے قہقہوں کی آوازیں گونجیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ ایلی نے دیکھا کہ وہ سفید سفید بازو تھامے تن تنہا کھڑا ہے اور فرش پر رنگین کپڑوں کی ایک گٹھڑی پڑی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان سفید بازوؤں کو کیا کرے اور اس گٹھڑی کو کس طرح کھولے ''تیم تیم'' اس نے بازوؤں کو جھنجھوڑا۔ ''تیم ادھر دیکھو۔'' اس نے گٹھڑی کو کھولنے کی کوشش کی مگر گٹھڑی اور بھی سمٹ گئی۔ وہ اس بند گٹھڑی سے گویا

کشتی لڑنے میں مصروف ہو گیا۔ مگر اس کی کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ گٹھڑی کے پلو اور بھی لپٹ گئے۔ حتیٰ کہ وہ بازو بھی کہیں گم ہو گیا اور وہ گٹھڑی اس کے قدموں میں کپڑوں کا ایک ڈھیر سا بن کر رہ گئی۔ ''تیم تیم'' وہ چلایا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ''تیم.....'' اوپر سے بڑھیا کی آواز سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ تڑپ کر وہ گیند اس کے ہاتھوں نے پھسل کر نکل گئی۔ ایک ساعت کے لئے زینے میں رنگین پلو لہرایا پھر کوٹھے سے ایک سرخ چہرے نے اس کی طرف مڑ کی دیکھا۔ جیسے وہ باغات کا بنا ہوا ہو پھر اس مکان پر موت کا سکوت چھا گیا۔ دالانوں کے خاموش کونے گویا باہر نکل آئے اور اس پر ہنسنے لگے۔ اس کا تمسخر اڑانے لگے۔ ''تم تم'' اور کوٹھے کے پردے جھک جھک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ''بیچارہ۔ بیچارہ۔''

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ اس کا راز کھل چکا ہے۔ وہ سب جان گئی ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ ایک گٹھڑی تک نہیں کھول سکتا۔ دو بازوؤں کو نہیں سنبھال سکتا۔ بیچارہ اس نے محسوس کیا کہ وہ سب دالانوں کی دیواروں کے پیچھے کھڑی اس پر ہنس رہی ہیں اور اوپر کوٹھے پر تیم مایوس و محروم کھڑی ہے۔ اور اس کا چہرہ جذبہ تحقیر سے سرخ ہو رہا ہے۔ صحن میں پڑا ہوا سائیکل سرک کر پرے ہٹ ہٹ گیا۔ جیسے وہ اپنا آپ اس کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ ایلی کی پیشانی پر پسینہ آ گیا اور وہ سائیکل اٹھا کر بھاگا۔ بورڈنگ کی طرف جاتے ہوئے رہ رہ کر اسے اپنی بزدلی اور حماقت کا احساس ہوتا اور محسوس کرتا کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ اتنا اچھا موقعہ ملنے کے باوجود وہ کچھ نہ کر سکا۔ وہاں اتنی لڑکیاں تھیں۔ مگر وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکا حتیٰ کہ وہ تیم کی شکل بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کے دل میں اس واقعے کی یاد کانٹا بن کر چبھنے لگی اس طرح وہ واقعہ اس کے لئے ایک تلخ اور خوشگوار واقعہ بن گیا۔ ''بیچارہ۔ بیچارہ۔ بیچارہ۔'' سائیکل کا فری ویل چلا رہا تھا اور سڑک پر دھندلی اشکال اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔

اس واقعہ کے بعد مدت تک ایلی کو آغا کے گھر جانے کی جرات نہ ہوئی۔ جب بھی آغا کے مکان کے متعلق اسے خیال آتا تو وہ محسوس کرتا کہ اس کا راز فاش ہو چکا ہے، اس کوچے کی تمام نوجوان لڑکیاں چوباروں میں کھڑی اس پر ہنس رہی ہیں۔ اس پر انگلیاں اٹھا رہی ہیں۔ ''وہی ہے وہی۔'' اس خیال کے آتے ہی اسے پسینہ آ جاتا۔

کھلاڑی

پھر اتفاق سے کالج میں ایک نئی تحریک شروع ہو گئی، جس نے ایلی کی توجہ کو جذب کر لیا۔ یہ تحریک ایک ڈرامہ کھیلنے کی تحریک تھی۔ مگر اس تحریک کی ابتدا انوکھی تھی اور اس کی تمام تر ذمہ داری اللہ داد پر عائد ہوتی ہے۔

اللہ داد فطری طور پر ایک مسخرہ واقع ہوا تھا اور اس کا مذاق اس قدر سنجیدگی کا پہلو لئے ہوتا کہ انسان کو بے اختیار ہنسی آ جاتی مثال کے طور پر کالج میں اس کا داخلہ بھی انوکھے انداز سے ہوا تھا۔ ایک روز چادر باندھے ایک تھیلا سی قمیص پہنے اور شانے پر ایک بڑا سا رومال ڈالے وہ کالج کی کمپاؤنڈ میں کھڑا حسرت سے لڑکوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اتفاق سے پرنسپل اس طرف سے گزرا پرنسپل اسے کھڑا دیکھ کر سمجھا کہ کوئی جاٹ کالج کی حدود میں آ گھسا ہے۔ پرنسپل اس کے قریب آ کر کھڑا ہوا۔ اس پر وہ جھجک محسوس کئے بغیر وہیں کھڑا رہا۔

''اے چودھری۔'' پرنسپل نے کہا ''یہاں کیا کر رہا ہے تو؟''

''میں۔'' وہ چونکا۔ ''دیکھتا نہیں کہ کھڑا ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں کر رہا۔'' یہ کہہ کر وہ پھر لڑکوں کو دیکھنے لگا جو کمپاؤنڈ میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔

''کسی سے ملے گا کیا؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''اونہوں بھئی۔ دیکھ رہے ہیں۔ کرکٹ کا کھیل۔''

کرکٹ کا لفظ سن کر پرنسپل چونکا۔ ''پڑھے لکھے ہو کیا؟''

''اور تو کیا ویسے ہی کھڑے ہیں۔'' وہ بولا۔

''یہاں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں۔'' پرنسپل بولا۔ ''یہ کالج گراؤنڈ ہے۔''

''اچھا۔'' وہ بولا ''اجازت نہیں تو چلے جاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ پھلانگ کر کالج کی چار دیواری پر چڑھ گیا اور دیوار پر بیٹھ کر کرکٹ دیکھنے لگا۔

اس پر پرنسپل کو بے حد طیش آیا اور اس نے قریب جا کر کہا۔ ''اب دیوار پر بیٹھ گئے۔''

''تم نے جو کہا تھا کہ گراؤنڈ میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں۔ اب کیا یہاں بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں۔'' وہ تنک کر بولا۔

پرنسپل کو اس کی دہقانیت پر ہنسی آ گئی۔ بولا ''تم اس کھیل کو سمجھتے ہو کیا۔''

''سمجھتے۔'' اس نے پرنسپل کی طرف دیکھا۔ ''ہم نے تو اس کھیل کو کھیل کھیل کر چھوڑ دیا ہے۔ اب کسی زمانے میں کھیلا کرتے تھے۔''

''کہاں کھیلا کرتے تھے؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''مدرسے میں اور کہاں۔''

''اچھا تو مدرسے میں پڑھتے رہے ہو۔''

''ہاں'' وہ بولا ''دس پاس کی ہیں۔''

''اور اب کیا کرتے ہو۔''

''کچھ بھی نہیں۔''

''کرکٹ کھیلو گے آؤ تمہیں کھلائیں۔''

اللہ داد نے سمجھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ کہنے لگا۔ ''واہ کھڑا ہونے تو دیتے نہیں اور کہتے ہو کہ کرکٹ کھلائیں گے۔''

پرنسپل قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا اور پھر اسے پکڑ کر ٹیم میں لے گیا۔ ''لو بھئی ایک نیا پلیئر لائے ہیں ہم۔'' وہ بولا۔ اللہ داد نے گیند اٹھا لیا اور بائیں ہاتھ سے بال کرنا شروع

کر دیا اور ایک ہی اوور میں اس نے کالج کے دو بہترین کھلاڑیوں کی وکٹیں اڑا دیں تو پرنسپل نے واہ وا کا شور مچا دیا پھر پرنسپل اسے اپنی لینڈ و میں بٹھا کر گھر لے گیا اور اگلے ہی روز اسے کالج میں داخل کر لیا گیا۔ اس کی تمام فیسیں معاف کر دی گئیں بلکہ پور (Poor) فنڈ میں سے اس کے لئے کتابیں خریدی گئیں اور ایک جوڑا کپڑوں کا بنا کر دیا گیا تا کہ وہ مناسب کپڑے پہن کر کالج آ سکے۔

مسخرا

ایک روز اللہ داد برآمدے کے کونے پر کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا کہ گیارہویں کا کوئی چھوٹا سا لڑکا بھاگتا ہوا ادھر آ نکلا اور اللہ داد سے ٹکرا کر گر پڑا۔ اللہ داد نے لپک کر اسے اٹھایا۔ ''نہ بیٹا۔'' وہ بزرگانہ انداز میں بولا۔ ''اندھا دھند بھاگا نہیں کرتے۔'' اللہ داد نے اس کے کپڑے جھاڑے اور پھر اس کا منہ چوم کر کہا۔ ''نہ برخوردار ایسے نہیں کیا کرتے۔'' اس پر اردگرد کھڑے سب لڑکوں نے تالیاں پیٹ دیں اور بہت ہنگامہ برپا کیا۔ اس شور اور ہنگامے کی وجہ سے اس لڑکے نے جا کر پرنسپل سے رپورٹ کر دی۔ اس رپورٹ پر پرنسپل غصے میں آ گیا اور اس نے اللہ داد کو فوراً دفتر میں طلب کیا۔ ''اللہ داد تمہارے خلاف شکایت پہنچی ہے ہمیں۔'' انہوں نے غصے میں کہا۔ ''جی کیسی شکایت۔'' اللہ داد نے معصومیت سے پوچھا۔

''کیا یہ درست ہے کہ تم نے گوبند کا منہ چوما ہے؟'' وہ طیش میں بولے۔ ''جی ہاں۔'' اللہ داد نے سر جھکا لیا۔

''ہوں۔'' پرنسپل غرایا۔ ''تو تمہیں اس کی سزا ملنی چاہیے۔''

''غلطی ہو گئی مجھ سے جناب۔'' اللہ داد بولا۔

ممکن ہے اللہ داد کا یہ قصور بھی معاف کر دیا جاتا اور اسے آئندہ کے لئے سرزنش کر دی جاتی۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ ایسا ہی ہو گا کیونکہ ہر بات میں پرنسپل اللہ داد کی رعایت کیا کرتے تھے۔ بلکہ ایک روز اللہ داد کی شرارت پر تو پرنسپل صاحب نے

اعلانیہ قہقہہ مار کر کہہ دیا تھا۔ ''اللہ داد کو معاف نہ کروں تو اور کیا کروں اگر جرمانہ کر دوں تو وہ جرمانہ بھی کالج کے کسی فنڈ سے ہی ادا کرنا پڑے گا۔ بھئی اس کے پاس کچھ ہو بھی۔'' پرنسپل کی یہ بات سچی تھی۔ اللہ داد کے پاس کچھ بھی تو نہ تھا۔

لیکن اس روز پرنسپل بے حد غصے میں تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی اس بدتمیزی پر اسے پانچ روپے جرمانہ کر دیا۔ اللہ داد نے تو جرمانہ ادا نہ کیا۔ بہر حال دفتر نے جرمانے کی ادائیگی کے لئے تقاضا جاری رکھا۔ حتیٰ کہ اللہ داد کو احساس ہو گیا کہ اسے یہ جرمانہ ادا کرنا ہی ہو گا۔

ایک روز وہ شفیع سے کہنے لگا۔ ''یار شفیع اب تو اس جرمانے کا کچھ کرنا ہی ہو گا۔''

''کرنا کیا ہے؟'' شفیع بولا۔ ''پانچ روپے دے دو اور کیا۔''

''اچھا بھئی۔'' اللہ داد نے کہا۔ ''تو مجھے دس روپے قرض کے طور پر دے دے یار۔''

''ہاں یار دس ہی دے دو۔'' اس نے کہا۔ ''یا تو یہ زائد پانچ اصل کو بھی واپس لے آئے اور نہیں تو دسوں ہی گئے۔ یہ جوا کھیل ہی دیکھوں۔''

اگلے روز اکاؤنٹنٹ نے پرنسپل سے جا کر شکایت کی کہ اللہ داد پانچ کی بجائے دس روپے جرمانہ ادا کرنے پر مصر ہے یہ ایک عجیب و غریب شکایت تھی۔

اللہ داد کو طلب کیا گیا۔ ''یہ کیا حماقت ہے؟'' پرنسپل نے پوچھا۔ ''جرمانہ تو تمہیں پانچ روپے ہوا ہے اور تم دس ادا کر رہے ہو یہ کیا حماقت ہے۔''

اللہ داد نے سر جھکا لیا۔ ''نہیں حماقت نہیں جی۔'' وہ بولا۔ ''تو پھر کیا ہے؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''صاحب پانچ روپے تو جرمانہ دیا ہے اور پانچ روپے جمع کرا دیئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''جی کسی وقت پانچ روپے ہوتے ہیں۔ کسی وقت نہیں ہوتے اور ان

برخورداروں کا کیا اعتبار نہ جانے کب آ کر الجھ جائیں۔"

اللہ داد نے یہ بات کچھ ایسی سنجیدگی اور معصومیت سے کہی کہ پرنسپل قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ "تو مطلب یہ ہے کہ پانچ ایڈوانس کے طور دے رہے ہو۔ ہاہاہا۔" وہ ہنسے۔ "حد ہو گئی۔ اللہ داد تمہیں تو تھیٹر کا مسخرا ہونا چاہیے خواہ مخواہ کالج میں پڑھ کر وقت گنوا رہے ہو تم۔ ہی ہی ہی۔"

"حضور میرا کیا ہے۔ آپ نے کالج میں داخل کر لیا تو کالج میں داخل ہو گیا۔ تھیٹر میں داخل کر دیتے تو تھیٹر میں داخل ہو جاتا۔ میرا کیا ہے۔"

"اچھا تو تمہیں تھیٹر میں داخل کر دیں گے۔" پرنسپل ہنستا ہوا چلا گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو اللہ داد کا جرمانہ معاف کر دیا گیا اور دوسرے کالج کی مجلس تمثیل کا اجرا ہو گیا۔ اور چند ہی دنوں میں کالج میں شکنتلا کے کھیل کی ریہرسل شروع ہو گئی۔

شبھ لگن

ایلی کو موسیقی سے بے حد دلچسپی تھی۔ گانے کی آواز سن کر اس کے دل میں چوہے سے دوڑنے لگتے۔ دل بیٹھ جاتا ایک رنگین اداسی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی۔ جب سے شکنتلا کی ریہرسل شروع ہوئی تھی، اس کے لئے بورڈنگ میں جانا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ عام لڑکوں کو ریہرسل دیکھنے کی اجازت نہ تھی اور ریہرسل کے وقت ہال میں ان لڑکوں کا داخلہ ممنوع تھا، جن کو ڈرامہ کھیلنے کے لئے نہیں چنا گیا تھا۔ اس لئے جب ریہرسل شروع ہوتی تو وہ ہال سے باہر دروازے کے شیشے سے لگ کر دیکھتا رہتا اور جب سازندے حمد کی دھن بجاتے تو اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ چند ہی یوم میں ایلی کو تین چار مرتبہ ریہرسل سنتے پکڑ لیا گیا اور آخر کار ڈرامے کا انچارج اسے پرنسپل کے پاس لے گیا۔ پرنسپل نے پہلے تو اسے ڈانٹا ڈپٹا۔ پھر دفعتاً نہ جانے اسے کیا سوجھی بولا۔ "ہوں اگر تمہیں ڈرامے سے دلچسپی

ہے تو عملی طور پر ہماری مدد کیوں نہیں کرتے۔"

"عملی مدد۔" ایلی سوچنے لگا۔

"تم گا سکتے ہو؟" پرنسپل نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"ناچ سکتے ہو؟"

"جی نہیں۔"

"یہ اچھی دلچسپی ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔ "گا نہیں سکتے۔ ناچ نہیں سکتے مگر ڈرامے سے دلچسپی ہے۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کو پروفیسر انچارج کے حوالے کر دیا گیا کہ جو مناسب کام کر سکتا ہو، اس سے لیا جائے اور ایلی کو ریہرسل کے دوران ہال میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔

جب "حمد" کی مشق شروع ہوتی اور میراثی طبلے پر ہاتھ چلاتا تو ایلی کا دل ڈوب جاتا اور اس کے جسم پر بیر بہوٹیاں رینگنے لگتیں۔ خاص طور پر جب ربابیوں کا وہ چھوٹا سا لڑکا نور اپنی میٹھی میٹھی سی آواز میں "تو جگ کا ہے۔" کہتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا وہ سب کچھ بھول جاتا۔ تمام تلخ یادیں محو ہو جاتیں یہاں تک کہ وہ بائیسکل والا واقعہ بھی بھول جاتا جب وہ کپڑوں کی گٹھڑی کے بل کھولنے سے قاصر رہا تھا۔ اس وقت اسے شہزاد کا چھم سے آنا بھی بھول جاتا۔

پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ موسیقی اسے تلخ یادوں سے آزاد کر سکتی ہے۔ خصوصاً جب نور کیسی شبھ لگن سے بہار آئی گاتا تو ایلی یہ بھی بھول جاتا کہ وہ ایلی ہے کہ وہ علی احمد کا بیٹا ہے اور علی احمد کو ٹین کا سپاہی بننے سے دلچسپی ہے اسے سبھی کچھ بھول جاتا اور وہ حیرانی سے اس سانورے سے چھوٹے سے نور کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا۔ دیکھے چلا جاتا۔ اس وقت نور کے چہرے کے گرد ایک ہالا سا نمودار ہوتا

آنکھوں میں چمک لہراتی۔ بازو رقص کرنے لگتے۔ اس وقت اس کی آنکھیں باتیں کرتیں اس کے چتون اظہار سے چھلکتے۔ ان کا پیغام کس قدر حسین ہوتا۔

نور کو دیکھ کر پہلی مرتبہ ایلی کو نزہت کی عظمت کا احساس ہوا۔ اس کا گیت سن کر اس نے محسوس کیا جیسے واقعی بہار آ گئی ہو اور وہ شبھ لگن جس کی وجہ سے بہار آئی تھی۔ نور بذات خود ہو۔

اس کے بعد ایلی کئی ایک دن شبھ لگن اور بہار میں کھویا رہا۔ انتظار کرتے کرتے وہ تھک جاتا۔ لیکن کالج کا وقت ختم ہونے میں نہ آتا۔ خدا خدا کر کے ریہرسل کا وقت ہوتا اور نور ٹھمکتا ہوا ہال میں داخل ہوتا اور ایلی کے لئے بہار آتی۔

معصوم فاحشہ

لیکن چند ہی دن کے بعد ایلی پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس پتلے دبلے سانورے لڑکے میں دو شخصیتیں کام کر رہی ہیں۔ دو مختلف متضاد شخصیتیں۔ ایک وہ نور جو گاتے وقت اس میں بیدار ہوتا۔ وہ نور جس کی حرکات میں حسن کی جھلک دکھائی دیتی۔ جس کے گلے میں سے گویا پگھلی ہوئی چاندی کا ایک فوارہ چھوٹتا۔ لیکن جونہی وہ گانا ختم کر دیتا تو اس کی آنکھوں میں عریانی بھرا پیغام جھلکتا اور اس کی حرکات سے سستے پن کا مظاہرہ ہوتا۔

نور کی چال تو بالکل ان عورتوں کی طرح تھی۔ جو کٹڑ ارنگین میں دوسرے درجے کے چوباروں میں بیٹھتی تھیں۔ نور کی ان باتوں کو دیکھ کر ایلی کو دکھ سا محسوس ہوتا اور وہ جلد ہی کسی اور بات کی طرف توجہ منعطف کر لیتا تا کہ خیال ہٹ جائے۔ مگر اس کے باوجود اس کے دل میں کانٹا سا چبھا رہتا۔ پھر وہ شدید کوشش سے تصور کے زور پر اس نور کو گانے والے نور میں بدل دیتا اور یوں وہ عریاں منظر شبھ لگن میں تبدیل ہو جاتا اور بہار آ جاتی۔

جب آصف کو ایلی کی اس نئی دلچسپی کا علم ہوا تو وہ بہت ہنسا کہنے لگا۔ ”اچھا بھئی

آج دیکھیں گے تمہارا نور۔'' اس شام کو آصف گال ہتھیلی پر رکھے بیٹھا نور کا گانا سنتا رہا حتیٰ کہ اس کی آنکھیں شفاف پانی کی مچھلیوں میں بدل گئیں اس کے ہونٹوں کی وہ تمسخر آمیز سلوٹ دور ہو گئی اور پاؤں انجانے میں تال دینے لگے۔

اس کے بعد آصف اور ایلی فارغ وقت میں نور کو لے کر آموں والی کوٹھی کے قریب نہر کے کنارے چلے جاتے۔ ایلی کسی پیڑ تلے بیٹھ جاتا۔ آصف ندی میں پاؤں لٹکا لیتا اور نور گاتا اور اس شبھ لگن میں ایلی کی نگاہوں تلے گھنگھریالی لٹ لہراتی اور آصف کی آنکھیں جھیلوں میں تیرتیں اور سوکھے ہوئے درختوں پر ہریاول یورش کرتی اور ندی کا پانی ناچتا اور آسمان پر پرندے رقص کرتے۔

گانے کے اختتام پر نور کی آنکھ میں وہ نورانی چمک بجھ جاتی اور ایک رنڈی کپڑے اتار ننگی ہو کر ان کے روبرو آ کھڑی ہوتی اور نمائش کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ ہونٹ جونکوں کی طرح ان کی طرف بڑھتے اور وہ دونوں گھبرا کر وہاں سے چل دیتے اور سوچتے کہ کس طرح اس سے اپنا پیچھا چھڑائیں۔ اس وقت انہیں یہ فکر دامن گیر ہو جاتا کہ کوئی انہیں نور کے ساتھ دیکھ نہ پائے۔ لیکن جونہی وہ نور سے جدا ہوتے۔ تو وہ اس کے خیال میں کھو جاتے۔ شبھ لگن پھر کب آئے گا۔

اتفاق سے ایک روز شیخ ہمدم بھی آ گئے اور ان تینوں نے مل کر شبھ لگن منائی لیکن شیخ ہمدم خاموش ہو گئے اور پھر مخصوص انداز میں کہنے لگے۔ ''یہ سب ٹھیک ہے۔ الیاس صاحب! لیکن امرتسر کے ربابیے لڑکے سے نہر کے کنارے پر گانا سننا اور پھر ماشاءاللہ گانے والے جناب نور صاحب ہوں بات ذرا خطرناک ہے۔''

''خطرناک ہے۔'' ایلی کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر بات خطرناک کیوں تھی۔ اس میں خطرے کی کیا بات تھی۔ نور ان کے ساتھ بے حد مانوس ہو چکا تھا اور اب تو اس پر واضح ہو چکا تھا کہ ان کا مقصد موسیقی کے سوا کچھ نہیں اور اس کا پاؤں ٹھمکانا، آنکھیں مٹکانا اور ہونٹ نکالنا قطعی طور پر بے کار تھا۔ ایلی نے اب سے پہلے کبھی اتنے

چھوٹے بچے کو ایسی عریاں حرکات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

نورچند ایک روز کے لئے تو ان کا منہ تکتا رہا پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا یہ نیا تعلق اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا تعلق ہے تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ سمجھ میں آتی تو بھی اسے یقین نہیں پڑتا تھا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا ایک روز وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''خدا کے لئے مجھے بچا لو۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں یہ زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ پتلے پتلے ہونٹ لرز رہے تھے اور وہ امید بھری نگاہوں سے ایلی اور آصف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ندی کے کنارے پر سوکھے ہوئے درخت جو شبھ لگن سے ہرے ہو چکے تھے۔ پھر سے سوکھ گئے۔ ندی کے پانی کی روانی تھم گئی۔ جیسے وہ ایک جوہڑ بن گئی ہو اور ان کے اردگرد ایک وسیع ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔

بیگانے دوست

ایک روز آصف بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

''ایلی'' وہ بولا۔ ''وہ۔ وہ سفینہ پھر یہاں آ رہی ہے۔ اگر وہ آ گئی تو پھر میں کیا کروں گا۔ چلو ہم امرتسر سے بھاگ چلیں ایلی۔''

''لیکن جائیں کہاں۔'' ایلی نے پوچھا۔

''کہیں بھی۔'' اس نے آہ بھر کر کہا۔

''نہیں آصف۔'' ایلی نے سنجیدگی سی جواب دیا۔ ''اگر وہاں بھی لڑکیوں نے تمہیں سلام کرنے شروع کر دیئے تو۔''

''تو.....تو.....'' آصف سوچنے لگا۔ ''تو میں کیا کروں۔'' اس نے بے بسی سے ہاتھ چلایا۔

''تم ان کی شکایت کرنا چھوڑ دو۔'' ایلی نے سوچ کر کہا۔ ''شکایتوں کی وجہ سے

وہ چڑ جاتی ہیں۔ضد پیدا ہوتی ہے۔تم خود انہیں سلام کرنا شروع کر دو تا کہ وہ خود تمہاری شکائتیں کریں۔"

"میری شکائتیں۔" آصف گھبرا کر بولا۔"نہیں نہیں یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اگر تم انہیں سلام کرنا شروع کر دو گے تو ان کا برتاؤ محبوب کا سا ہو جائے گا۔" ایلی نے کہا۔"اور وہ تم سے دور بھاگنے لگیں گی۔انہیں دور بھگانے کی یہی ایک ترکیب ہے۔"

"اچھا۔" آصف نے تالی بجائی۔"کیا یہ چلے گی۔پھر تو بہت اچھا ہے۔"

آصف سمجھ رہا تھا کہ ایلی اسے مشورہ دے رہا تھا۔حالانکہ درحقیقت مشورے کے پردے میں وہ اپنی مشکل بیان کر رہا تھا۔وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی لڑکی ایسی نہ تھی جو صبح سویرے اٹھ کر اسے سلام کرتی ہو۔کوئی بھی تو نہ تھی جو اس کے لئے بیقرار ہو۔بلکہ قریب آ کر وہ گٹھڑی کی طرح سمٹ جاتی تھیں اور کوشش کے باوجود بھی کھل نہ سکتی تھیں۔

"لیکن لیکن آصف۔" ایلی نے کہا۔"ایسا کیوں ہوتا ہے اگر تم ان کی تلاش میں سرگرداں ہو جاؤ تو وہ دور بھاگتی ہیں اور اگر تم ان سے دور بھاگو تو وہ تمہارا پیچھا کرتی ہیں۔"

"ہاں" آصف گنگنایا۔"مگر میں ان کی تلاش میں کیسے کھو جاؤں۔"

اس کے برعکس ایلی سوچ رہا تھا کہ وہ انہیں اپنی تلاش میں کیسے سرگرداں کرے۔ کس طرح انہیں تلاش پر مائل کرے۔

وہ دونوں بہترین دوست تھے لیکن ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کس قدر دور تھے۔کس قدر بیگانہ۔ان کی مشکلات ایک دوسرے سے کس قدر مختلف اور متضاد تھیں۔

''اچھا۔'' آصف نے کہا۔ ''تو مجھے بتاؤ کہ میں کس طرح ان پر ظاہر کروں کہ میں ان کا متلاشی ہوں۔''

''تم صبح اٹھ کر ان کو سلام کرنا شروع کر دو۔'' ایلی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اور کبھی کبھی دوپہر یا شام کو کوشش کر کے کوٹھے یا کھڑکی سے اسے دیکھ لیا کرو۔''

''اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔'' آصف بولا۔

اور ایلی نے دل میں سوچا اچھا میں کوشش کروں گا کہ کسی کو اپنے لئے سرگرداں کروں۔ مائل جستجو کروں۔

وہ کوچہ

ایلی اب محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ سمندر میں بہتا ہوا تنکا ہو۔ خصوصاً جب وہ اس کوچے میں جاتا تو یہ احساس اس کی رگ و پے میں بس جاتا۔ وہاں پہنچ کر وہ محسوس کرنے لگتا جیسے زندگی ایک گرداب ہو جس میں افراد کی چھوٹی چھوٹی قندیلیں اپنی اپنی دھن میں سلگ رہی ہوں اور گرداب کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ دیوانہ وار گھوم رہی ہوں۔

جب کبھی شام کے وقت ایلی آغا سے ملنے ان کے یہاں جاتا تو آغا ایلی کو لے کر ڈیوڑھی کے باہر کھڑے ہو جاتے تاکہ کٹڑے میں چلتے پھرتے لوگوں کا تماشا کر سکیں۔ کٹڑے میں لوگ پان کھاتے، سگریٹ کے کش لیتے اور نگاہوں کی انگلیوں سے چوباروں میں بیٹھی ہوئی رقاصاؤں کو چھیڑتے۔ اشارے کرتے۔ تماشبین تانگوں میں بیٹھ کر چوباروں کی طرف گرم نگاہیں ڈالتے ہوئے گزر جاتے۔ مزدوروں کے گروہ کوچے میں ٹہلتے۔ تاجر نگاہیں جھکائے قدم اٹھاتے ہوئے نکل جاتے۔ شوقین مزاج دوکانداروں کی نگاہیں گاہکوں اور رقاصوں کے درمیان یوں گھومتیں جیسے گھڑی کا پنڈولم چلتا ہے۔

ہر چند گھنٹوں کے بعد کٹڑے میں کوئی ایسا شخص بھی آ نکلتا جسے دیکھ کر لوگوں کی

نگاہیں چوباروں سے ہٹ کر اس کی طرف منعطف ہو جاتیں۔ بازار میں ایک مدھم سی سرگوشی ابھرتی۔

''کون ہے۔''

''ہائیں یہ ہے وہ۔''

''کیسے دیکھ رہا ہے۔''

''یارانہ ہے اس سے کیا؟''

اور وہ سرگوشی برف کی گیند کی طرح لڑھکتی۔ لڑھکے جاتی۔ حتیٰ کہ سارا کٹڑا اس کی لپیٹ میں آ جاتا۔ رقاصائیں بھی اپنے بے نیازانہ انداز کو چھوڑ کر بچوں کی طرح بازار کی طرف دیکھنے لگتیں اور چند ساعت کیلئے انہیں یاد نہ رہتا کہ وہ دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ اپنا آپ دکھانے کے لئے وہاں بیٹھی ہیں۔ اس وقت رقاصاؤں میں نسائیت کی جھلک نمودار ہو جاتی اور محسوس ہونے لگتا کہ وہ گڑیاں نہیں بلکہ جیتی جاگتی عورتیں ہیں۔

لکھنؤ، الہ آباد یا مدراس کا کوئی مشہور سازندہ آ جاتا یا کوئی پیرانوکھا لباس پہنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کٹڑے میں داخل ہوتا۔ وہاں مشہور ڈاکو اور لٹیرے آیا کرتے تھے۔ کروڑ پتی اور گویے تو اکثر آتے۔ لیکن کٹڑے میں سب سے زیادہ دھوم انسپکٹر رؤف کی تھی۔

انسپکٹر رؤف

اگر انسپکٹر رؤف آ جاتا تو فوراً بازار پر سناٹا چھا جاتا۔ پنواڑی سہم کر پیچھے ہٹ جاتے۔ دوکاندار چوباروں کی طرف دیکھنا موقوف کر دیتے۔ راہ گیر نگاہیں جھکا لیتے۔ ادھر چوباروں میں سرخی بھرے چہرے زرد پڑ جاتے۔ نگاہوں میں شوخی کی جگہ گھبراہٹ دوڑ جاتی۔ رقاصائیں یوں چپ چاپ گردن جھکائے بیٹھ جاتیں جیسے طبیعت ناساز ہو۔

اس زمانے میں کٹڑے پر رؤف کی حکومت تھی۔ وہ کٹڑا اس کی ریاست تھی۔ جب شام کے وقت وردی پر سیٹی بیلٹ لگائے۔ سر پر طرے دار پگڑی باندھے اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ وہ کٹڑے میں نکلتا تو ایک سرگوشی ابھرتی اور تیزی سے یہاں سے وہاں تک دوڑ جاتی اور اپنے عقب میں بھیانک خاموشی چھوڑ جاتی۔

پنواڑی چوباروں کی طرف تاڑنے کا شغل چھوڑ کر شدت سے پان بنانے میں مصروف ہو جاتے۔ دوکان پر کھڑے شوقین نظریں لڑانے کا خیال موقوف کر دیتے۔ جنرل مرچنٹس کے سیلز مین حساب کتاب کے رجسٹر کھول کر مصروف ہو جاتے۔

انسپکٹر رؤف کی آمد کی خبر سن کر چوباروں میں سازندوں کے ہاتھ لرز کر ممنوع سروں پر جا پڑتے دکھ بھری سروں پر قیام لمبے ہو جاتے۔ سارنگیاں ناچنا چھوڑ کر رونا شروع کر دیتیں اور مسکراتی ہوئی رقاصائیں گھبرا کر گانا چھوڑ دیتیں اور کھوئے ہوئے انداز میں پان لگانے بیٹھ جاتیں۔

انسپکٹر رؤف تمہید کے طور پر کٹڑے کے دو تین چکر لگاتے۔ پھر کسی چوبارے کے دروازے پر اپنے سپاہی کو متعین کر دیتے اور خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا پہنچتے۔ ان کے سیڑھیاں چڑھتے ہی وہ طلسم گویا ٹوٹ جاتا۔ اس وقت کوئی پنواڑی نعرہ لگاتا ''علی'' اس کا وہ نعرہ ''کن'' بن کر کٹڑے میں گونجتا اور کٹڑے میں رکی ہوئی زندگی پھر سے حرکت میں آ جاتی۔ تماش بینوں کی نگاہیں بے باکی سے کھڑکیوں پر منڈلانا شروع کر دیتیں۔ پنواڑیوں کی دوکانوں پر کھڑے شرفا پھر سے رقاصاؤں کو تاڑنے لگتے۔ رقاصاؤں کے ہونٹوں پر ایک بار پھر تبسم لہراتا اور ان کے دل سے بوجھ اتر جاتا۔

البتہ جس چوبارے پر انسپکٹر رؤف چڑھ جاتے تھے وہاں لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہو جاتی۔ محفل برخواست ہو جاتی۔ سیٹھ اور تاجر چپکے سے نیچے اتر آتے۔

میراثی ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے۔

پھر اگر رؤف کے حکم کے مطابق وہاں راگ رنگ ہوتا بھی تو سارنگیاں گانے کی بجائے بین کو تین طبلہ سر پیٹتا۔ پھر کچھ دیر بعد چوبارے سے انسپکٹر رؤف کے دھاڑنے کی آوازیں آتیں جو سارے کٹڑے میں گونجتیں۔ وہ نشے میں چیختا چلاتا دھمکیاں دیتا۔ غلیظ گالیاں دیتا اور پھر ایسے لگتا جیسے چوبارے میں دنگا فساد ہو رہا ہو۔ وہ بالآخر بتیاں بجھ جاتیں اور سکوت چھا جاتا اور کٹڑے والے محسوس کرتے جیسے اس گہری خاموشی سے کراہوں کی آواز آ رہی ہو۔

انسپکٹر رؤف کے علاوہ کوئی دوسری شخصیت جو کٹڑے پر اثر انداز ہوتی تھی، پیر سبز پوش کی تھی۔ جب بھی وہ کٹڑے میں داخل ہوتے تو ایک تعجب اور خاموشی بھری سرگوشی بلند ہوتی۔ پنواڑی پان لگانا چھوڑ دیتے۔ تماش بینوں کی نگاہیں چوباروں سے ہٹ کر پیر صاحب کے چہرے اور لباس پر مرکوز ہو جاتیں۔ سیلز مین دوکان کے اندرونی حصے سے دوڑ کر باہر آ کھڑے ہوتے اور رقاصائیں جنگلوں پر کھڑی ہو کر نیچے دیکھنے لگ جاتیں۔

پیر صاحب کے سبز ریشمیں پیراہن پر ان کی لانبی سیاہ زلفیں لٹکتیں ان کے سر پر ریشمیں سبز رومال عربی انداز سے بندھا ہوتا اور ان کا حسین نسائی چہرہ چمکتا اور رسیلی سیاہ آنکھیں جھکی رہتیں۔ ان کے خدوخال ستواں تھے۔ ان کی آنکھیں دیکھنے والی نہیں بلکہ دکھنے والی تھیں اور انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کوئی حسین عورت جوگی لباس پہنے چوبارے سے اتر کر تفریحاً کٹڑے کے بازار میں گھوم کر اپنی نمائش کر رہی ہو۔

آنچل اور گٹھڑیاں

اس کوچے کو دیکھ کر نہ جانے ایلی کو کیا ہو جاتا۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگتیں اور پھر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ وہیں کھڑا

دیکھتا رہے۔ دیکھتا رہے۔

اب اس کے لئے آغا کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ جب بھی وہ وہاں بیٹھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ کوئی اس پر ہنس رہا ہے۔ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ ایک رنگین آنچل لہراتا دکھائی دیتا اور پھر بہت سے کپڑے لپٹ لپٹ کر گٹھڑی کی شکل اختیار کر لیتے اور وہ گٹھڑی لڑھکتی اور کوئی ہنستا جیسے مذاق اڑاتا۔ ایلی گھبرا کر اٹھتا اور زینے کی طرف بھاگتا زینے میں کھڑی نیم کے ہونٹوں پر پراسرار تبسم ہوتا ''آ گئے، آ گئے۔'' وہ آنکھیں مٹکا کر کہتی۔ ایلی کو اس کی آواز میں بلا کا طنز محسوس ہوتا پھر وہ باہر نکل جاتا اور بازار کے کسی کونے میں کھڑا ہو کر لوگوں کی طرف دیکھنے میں کھو جاتا۔

کالج میں جب آصف مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا۔ ''ایلی تسلیم۔'' تو ایک ریشمیں گٹھڑی دھم سے ان کے درمیان آ کر گرتی اور اس کا راز کھول دیتی۔ وہ محسوس کرتا کہ آصف اس کے راز سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایلی ایک ریشمیں گٹھڑی کھولنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا۔

پھر شام کو وہ دونوں آموں کی کوٹھی کے قریب نہر کے کنارے نور سے ملتے اور نور کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر گاتا اور شبھ لگن سے بہار آ جاتی۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ نور کے لئے شہر سے اتنی دور چل کر آموں کی کوٹھی تک پہنچنا مشکل تھا اور نور کو اس کے گھر سے بلانا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ نور محلے کے لڑکوں سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی جا کر گھر سے اسے بلائے۔ نور سے ایک جگہ مقرر کر لی جاتی اور ایلی مقررہ وقت پر وہاں جا کر نور کو اپنے بائیسکل پر بٹھا کر بورڈنگ میں لے آتا۔ ایلی کو یہ احساس نہ تھا کہ نور کو یوں بائیسکل پر لانا خطرے سے خالی نہیں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ نور کو یوں بائیسکل پر لانا خطرے سے خالی نہیں اسے معلوم نہ تھا کہ کسی لڑکے سے دوستی کی وجہ سے عداوت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

ایک روز جب ایلی سفید چوک میں کھڑا نور کا انتظار کر رہا تھا تو ایک پہلوان قسم کا شخص آ گیا اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔ ''دیکھ بابو تو نور کا پیچھا چھوڑ دے ورنہ خون بہہ جائے گا اور تیری کھلڑی اتر جائے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے غصے میں نل پر ایک گھونسہ مارا۔ پانی کا ایک فوارہ چھوٹا اور ایلی کے کپڑے بھیگ گئے۔

اس روز آصف اور ایلی تن تنہا نہر کے کنارے خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ سورج کی سرخ دھاریاں دھندلی پڑ گئیں۔ اور دور شہر کی بتیاں روشن ہو کر ناچنے لگیں۔ مگر شبھ لگن سے بہار نہ آئی۔ دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

پھر ایلی نے کہا۔ ''آصف میرا یہاں جی نہیں لگتا۔''

''اچھا۔'' آصف نے مسکرا کر پوچھا۔ ''تو پھر کیا کیا جائے۔''

''تو پھر میں علی پور سے ہو آؤں کیا۔'' ایلی نے کہا۔

''اس سے کیا ہوگا۔''

''پتہ نہیں۔'' ایلی بولا۔ ''شاید.....''۔

''اچھا۔'' آصف نے آہ بھری۔ ''لیکن میں کہاں جاؤں۔''

''کیوں۔ تم تو یہاں خوش ہو۔''

''ہاں خوش ہوں۔ بڑا خوش ہوں لیکن۔'' آصف نے آہ بھری۔ ''لیکن کیا۔'' ایلی نے کہا۔

''معلوم نہیں۔'' آصف نے سر جھکا لیا ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے اب یہ شہر ویران ہو گیا ہے۔ جیسے کچھ باقی نہیں رہا جیسے کچھ کھو گیا ہے۔''

''اب تو وہ یہاں نہیں۔ اب تو تمہیں کوئی تنگ نہیں کرتی۔'' ایلی نے طنزاً کہا۔

''ہاں۔'' آصف نے آہ بھری۔ ''اب مجھے کوئی تنگ نہیں کرتی۔''

''پھر بھی تم اداس ہو۔ عجیب بات ہے۔'' ایلی بولا۔

''ہاں.....'' آصف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''عجیب بات ہے۔ اچھا تم ہو آؤ

علی پور سے۔" اس نے آہ بھری۔ "کاش کہ میرا بھی کوئی علی پور ہوتا۔"

اس روز وہ دونوں دیر تک اندھیرے میں نہر کے کنارے بیٹھے رہے حتیٰ کہ اللہ دادلکڑی اٹھائے ان کی تلاش میں آ پہنچا۔

"ارے یہاں بیٹھے ہو تم دونوں۔" وہ چلایا۔ "اور میں سمجھا شاید نہر میں ڈوب گئے جو ابھی تک نہیں آئے۔" "ہاں۔" وہ انہیں خاموش دیکھ کر چلایا۔ "کیا کر رہے ہو میاں۔ یوں چپ چاپ بیٹھنے سے مطلب چلو ایلی چلو۔"

رات کے وقت لیٹے ہوئے ایلی نے شدت سے محسوس کیا جیسے شبھ لگن گزر گئی ہو اور بہار کے بعد چاروں طرف خزاں کی ویرانی چھا گئی ہو۔ چاروں طرف ایک لٹی ہوئی دنیا تھی۔ دور ندی کا دھارا اداس آواز میں گنگنا رہا تھا۔ لہریں ہچکیاں لے رہی تھیں۔ درخت شائیں شائیں بھر رہے تھے۔ رسوئی میں رامو بھدی آواز میں کچھ گنگنا رہا تھا اور چاروں طرف گھپ اندھیرا لہریں مار رہا تھا۔

اس کا خیال تیم کی طرف منعطف ہو گیا۔ ایک گٹھڑی سی لپٹ گئی۔ ایک قہقہہ بلند ہوا اور زرد و اداس چہرے ستونوں کی اوٹ سے نکل کر جھانکنے لگے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تمسخر سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

گھبرا کر اس نے باورچی خانے کے نل کو گھورنا شروع کر دیا۔..... کتنا غلیظ نل ہے۔ اس نے جھرجھری لی۔ نہ جانے رامو کہاں ہے کس کام میں لگا ہے۔ شاید برتن صاف کر رہا ہو۔ شاید رسوئی میں بیٹھا ہو۔ اس کی نگاہ پھر نل پر رک گئی۔ اگر اس کے گرد اینٹوں کا چبوترا بنا دیا جائے تو اس کی نگاہ میں نل کے گرد ایک صاف ستھرا چبوترہ بن گیا۔ "اور بابو۔" ایک بدمعاش اس کی طرف لپکا۔ "کھلڑی اتر جائے گی تیری۔ ہاں۔" ایلی نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ نل سے چھینٹے اڑ رہے ہیں اور وہ شرابور ہو چکا ہے۔

اگلے روز ایلی گاڑی میں علی پور جا رہا تھا۔

بخار کی وجہ سے اس کی کنپٹیاں تھرک رہی تھیں۔ دل میں دھنکی بج رہی تھی۔ گاڑی ہرے بھرے کھیتوں میں جا رہی تھی۔ یہاں وہاں سبز گٹھڑیاں بندھی پڑی تھیں۔

ایک گٹھڑی قریب آتی۔ دفعتاً اس میں سے دو حنا مالیدہ ہاتھ ایلی کی طرف لپکتے اور پھر شمیم کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی۔ ''ہی ہی ہی'' علی احمد قہقہہ مارتے۔ ''کشمیر کے سیبوں پر پلی ہے ہاں۔''

دوسری گٹھڑی کے پٹ کھل جاتے۔ بھوؤں کے عین درمیان ایک تارہ چمکتا۔ جیسے وہ روشن بندی ہو۔ پھر سیاہ جھیلوں میں دو دیئے روشن ہو جاتے۔

''رے رے رے رے۔'' ارجمند چھاتی پیٹتا۔ ''جب سے اس پنڈورا کی گٹھڑی کے پٹ کھلے ہیں اک قیامت ٹوٹ پڑی ہے محلے پر۔''

لڑھکتی ہوئی ایک اور گٹھڑی قریب آ جاتی اور کھلنے کی بجائے مزید لپٹ جاتی۔ پٹ اور بھی بند ہو جاتے۔ پھر چاروں طرف سے حسین چہرے جھانکتے۔ ایک قہقہہ ابھرتا۔ ''بے چارہ بے چارہ۔''

ایلی چونک جاتا۔ وہ اپنے آپ کو جھنجھوڑتا۔ لیکن گزشتہ خفت کا احساس اس کے دل پر مسلط ہو جاتا۔ پھر سبز گٹھڑی قریب آ کر کہتی۔

''اسے بھول جاؤ ایلی۔ بھول جاؤ۔ میری طرف دیکھو۔ میری طرف۔''

گھبرا کر وہ لاحول پڑھنے لگتا۔ ''یہ میں کیا سوچ رہا ہوں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

پھر شریف اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ ''تم امتحان میں پاس ہو گئے ہو ایلی۔ تم میں جرات ہے۔ جاذبیت ہے۔'' ''ہاں ہاں'' شہزاد کہتی۔ ''اب تو ایلی سے ڈر آنے لگا ہے۔'' اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹتی اور دفعتاً ایلی دیکھتا کہ وہ اس پر جھک گئی ہے اور سیاہ جھیلوں پر کنول سے دیئے روشن ہو گئے ہیں۔

جب وہ محلے میں پہنچا تو شام پڑ چکی تھی۔ بڑی ڈیوڑھی ویران پڑی تھی چوگان میں کوئی نہ تھا۔ چپکے سے وہ گھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

گھر پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف دادی اماں کے کمرے میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ وہ چپکے سے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ دادی اماں کا تخت جہاں وہ نماز پڑھا کرتی تھی، خالی پڑا تھا۔ دادی اماں چارپائی پر بے حس و حرکت پڑی تھی اور سیدہ اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ حمیدہ اور رشیدہ چپ چاپ ایک کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔

دیر تک وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے آواز دی۔ ''دادی اماں'' سیدہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا دادی اماں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے نحیف و نزار آواز میں کہا۔ ''ایلی ہے اچھا اچھا۔'' اور پھر خاموش ہو گئیں۔

اس پر ایلی سیدہ سے چمٹ گیا۔ ''تم اس طرح سے کیوں بیٹھی ہو۔ دادی اماں کو کیا ہے وہ لیٹی ہوئی کیوں ہیں۔ بولتی کیوں نہیں۔ بولو۔ بولو۔ تم سب خاموش کیوں ہو۔'' سیدہ نے ایلی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اشارے سے بولی۔ ''چل اس کمرے میں یہاں نہیں۔''

جب وہ اس کمرے میں پہنچا تو وہاں ماں کو دیکھ کر اور بھی گھبرا گیا۔

''ایلی آیا ہے۔'' ہاجرہ چلائی۔ ''کب آیا تو۔''

''دادی اماں کو کیا ہوا ہے؟'' ایلی نے پوچھا۔

''اس کی حالت اچھی نہیں۔''

''بیمار ہے؟''

''ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ تو جا ادھر فرحت کی طرف۔ ادھر سو جا کے۔ یہاں ہم جو ہیں۔''

''لیکن مجھے دادی اماں۔''

''اسے اپنا ہوش نہیں۔ بہت تکلیف میں ہے جا شاباش۔'' ہاجرہ نے منت کی۔

''سیدہ'' وہ اس کے داخل ہونے پر چلا کر بولا۔ جواب میں سیدہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا۔..... ''شور نہ مچا ہوش آتا ہے تو وہ مچھلی کی طرح تڑپتی ہے۔ تین دن ہو چکے ہیں۔ بڑے عذاب میں مبتلا ہے۔ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔'' سیدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''آؤ ایلی.....'' ہاجرہ بولی۔ ''آؤ ادھر چلیں۔'' اور وہ دونوں چپ چاپ فرحت کے گھر کی طرف چل پڑے۔

''تیری دادی کی حالت اچھی نہیں۔ کیا معلوم کب آنکھیں بند کر لے۔'' ہاجرہ نے کہا۔

''لیکن۔'' ایلی نے پوچھا۔ ''کیا بیماری ہے؟''

''بیماری؟ اب میں اس کا جواب دوں۔'' ہاجرہ مسکرائی۔ ''عمر کا تقاضہ ہے آخر ایک نہ ایک دن جانا ہی ہے سب کو۔''

ایلی خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دادی اماں بہت ضعیف ہے لیکن اس کے مرنے کے متعلق اسے کبھی خیال نہ آیا تھا اور اب اس کے دل پر چوٹ سی لگی تھی۔

''سب انتظامات کر چکی ہے اپنے ہاتھوں سے وہ'' ہاجرہ نے کہا۔ ''کپڑا لتا غریبوں کو بانٹ چکی ہے۔ قل کے لئے چنے منگوا کر رکھ لئے ہیں۔ کل خود ہی ختم دیا۔ کفن کا کپڑا ابھی منگوا کر رکھا ہوا ہے۔ بس اب تو گھڑی پل کی بات ہے۔ جبھی تو میں رات کو ادھر ہی رہتی ہوں۔ لیکن ایلی تو ادھر فرحت ہی کی طرف سوئیو۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس آ جاؤں گی۔''

''ہوں۔'' ایلی خاموش ہو گیا۔

''تو دادی کے پاس سو کر کیا کرے گا۔'' ہاجرہ نے کہا۔ ''اسے تو اپنا ہوش نہیں اس

کا سانس بگڑتا ہے۔تو بڑی تکلیف ہوتی ہے اسے۔تو کیا خدمت کرے گا اس کی۔ اس نے تو کبھی کسی سے خدمت نہیں کرائی آج تک۔"

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ علی پور نہیں بلکہ امرتسر ہی میں ہو۔چاروں طرف اداسی چھائی ہوئی تھی۔ محلے کے اونچے لمبے مکانات خاموش کھڑے تھے۔ تانک چندی اینٹوں کی دیواریں رینگ رہی تھیں۔دیواروں پر چمگادڑیں منڈلا رہی تھیں وہ یوں چیخ رہی تھیں جیسے اس کی بیچارگی پر قہقہے لگا رہی ہوں۔کھڑکیاں ویران پڑی تھیں۔ جن پر سیاہ تیلیوں کے پردے جھول رہے تھے دور کچی حویلی میں کبڑی لالٹین سر جھکائے سوچ رہی تھی۔

فرحت کی طرف جاتے ہوئے ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے علی پور ایک ویرانہ ہو اس کے گرد ایک دھندلی اور لٹی ہوئی دنیا تھی۔جس میں کوئی بات بھی جاذب نظر نہ تھی وہ محسوس کر رہا تھا جیسے جینے کے لئے کوئی جواز باقی نہ رہا ہو۔جیسے زندگی اپنی تمام رنگینی اور دلچسپی کھو چکی ہو۔

گلال پچکاری

ہائیں۔وہ گھبرا کر رک گیا اس کے روبرو چوبارے میں شہزاد بیٹھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔تخت پر سینے کی مشین پڑی تھی۔جس کے ایک جانب دو بلوریں پاؤں قرینے سے رکھے تھے۔سیاہ جالی کے دوپٹے سے دو سفید نکل کر مشین کو تھامے ہوئے تھے۔ریشمیں ملبوس کے اوپر ایک متبسم چہرہ، دو نوکیلی آنکھیں اور ان پر پیشانی کا سیاہ تل۔گھبرا کر ایلی نے نگاہ جھکالی۔

شہزاد کے سرخ حنا مالیدہ ہاتھوں نے جیسے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مار دیا۔ سرخ بوندیاں ناچنے لگیں۔ایلی لڑکھڑا گیا۔

"تو آ گیا ایلی؟" شہزاد نے مسکرا کر پوچھا۔"دادی کی بیماری کی خبر سن کر آیا ہے؟"

''نہ۔ نہ نہیں تو۔'' ایلی نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''آپ یہاں ہیں۔'' دفعتاً اس غیر متحرک تصویر میں جنبش ہوئی۔ ایک چمک لہرائی چھپتی ہوئی چمک ''ہاں۔'' شہزاد مشین چلاتے ہوئے بولی۔ ''اب کی بار میں ان کے ساتھ نہیں گئی۔ میں نے کہا کچھ دیر یہاں رہ لوں بیٹھ جاتو.....''

''کھڑا کیوں ہے تو؟''

ایلی بیٹھ گیا اور شہزاد کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا۔ شہزاد سر اٹھا کر دیکھتی تو اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ چمکتی عجیب سی مسکراہٹ ایسے محسوس ہوتا کہ گلال بھری پچکاری چل گئی ہو جیسے شہزاد بہت قریب آ گئی ہو بہت قریب۔ اتنی قریب کہ قرب کی وجہ سے ایلی کے بند بند میں بتیاں سی روشن ہو گئی ہوں جیسے اس نے نہ جانے کیا پا لیا ہو لیکن جب شہزاد آنکھیں جھکا لیتی تو ایلی محسوس کرتا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا ہو چاروں طرف ویرانی اور اداسی چھا جاتی اس وقت ایلی کو شہزاد کے حنا مالیدہ ہاتھوں سے گھن آنے لگتی اس وقت وہ محسوس کرتا جیسے وہ ننگا ہو۔ جیسے اس کا وجود باعث ننگ ہو۔ احساس ندامت سے اس کا سر جھک جاتا اور وہ دل ہی دل میں لاحول پڑھنے لگتا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں شدت سے آرزو پیدا ہوتی کہ شہزاد ایک بار پھر نگاہ اٹھا کر دیکھے۔ اس منور پیشانی سے بجلی چمکے چھوٹی چھوٹی بتیاں یوں روشن ہو جاتیں جیسے گلال بھری پچکاری چل گئی ہو اور شہزاد کے حنا مالیدہ ہاتھوں کی پچکاری سے گلال کی پھوار پڑے۔ شہزاد کا انداز عجیب سا تھا۔ جب وہ مسکراتی تو فضا میں اثبات کی پھلجھڑیاں چل جاتیں۔ لیکن جب وہ سنجیدہ ہو جاتی تو بے نیازی کا دبیز پردہ پڑ جاتا اور پھر وہ گویا ایلی کی موجودگی اور گویا وجود سے بھی بے تعلق ہو جاتی۔ نہ جانے یہ کیا سحر تھا یوں لمحہ بھر میں اس قدر قریب آ جاتا اور پھر دوسرے لمحے میں جیسے کوئی کوسوں دور ہو۔

ایلی اکثر سوچتا تھا کہ وہ خصوصی مسکراہٹ کیا تھی جو قرب کا احساس دیتی تھی۔ نہ

جانے اس کی مسکراہٹ میں کیا جادو تھا۔ جیسے کوئی ان جانی شبھ لگن آ گئی ہو۔ اس نے کئی بار رفیق کی بیوی کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ دیکھی تھی مگر رفیق پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ گلال کی اس پچکاری تلے کھڑے ہو کر بھی وہ ویسے ہی خشک رہتا اور پھر تیوری چڑھا کر خشک آواز میں اسے ڈانٹتا "دوپٹہ سنبھالو۔ سر ننگا ہوا جا رہا ہے۔" اور پھر باہر نکل جاتا۔

کئی بار شریف کے پاس بیٹھے ہوئے اس نے محسوس کیا تھا کہ شہزاد کی آنکھوں میں وہی تبسم کی لہر چمک رہی ہے اور اس نے محسوس کیا تھا جیسے شہزاد واضح الفاظ میں اپنے خاوند سے کچھ کہہ رہی ہو۔ جیسے دور کھڑے رہنے کے باوجود اس کے قریب آ گئی ہو۔ اس کی گود میں بیٹھ گئی ہو۔ شریف اس کے جواب میں گھورتا تو نہیں تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں مسرت کی جگہ اداسی جھلکتی حسرت اور اداسی، اور پھر شہزاد اس کی حسرت بھری اداسی کو محسوس کر کے چونکتی۔ وہ بتی بجھ جاتی، اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ ایسی چمک اس نے مردوں کی آنکھوں میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہاں عورتوں کی آنکھوں میں کئی بار دیکھی تھی، لیکن عورتوں کی آنکھوں میں نہ جانے کیا ہوتا تھا۔ نہ جانے وہ نگاہ کیا تھی، مسکراتی تو وہ ویسے بھی تھیں لیکن ہر مسکراہٹ میں وہ بات پیدا نہ ہوتی تھی۔

شہزاد اکثر مسکرا مسکرا کر ایلی سے باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ مسکراہٹ محض سطحی ہو لیکن شریف کی طرف دیکھ کر مسکراتی تو ایلی تڑپ اٹھتا۔ وہ مسکراہٹ عام مسکراہٹ سے کس قدر مختلف ہوتی تھی۔ ایلی کا جی چاہتا کہ کوئی اس کی طرف بھی وہی مسکراہٹ لہرائے۔ ویسی ہی مسکراہٹ سے دیکھے۔ ان دنوں ایلی کی سب سے بڑی آرزو اور حسرت وہ مسکراہٹ تھی۔

ایلی کے جسم کا بند بند اس نگاہ کا بھوکا تھا اور پھر شہزاد سے "میرے ایسے نصیب کہاں۔" وہ سوچتا کہ شہزاد میرے طرف وہ نگاہ ڈالے۔ پھر بھی کبھی کبھار وہ محسوس

کرتا کہ وہ گلال بھری پچکاری چلا ہی چاہتی ہے اور وہ شرابور ہوا ہی چاہتا ہے۔ لیکن دفعتاً نہ جانے کیا ہو جاتا۔ بات بگڑ جاتی، گلال کی جگہ دو ایک پھول پتیاں برستیں اور پھر مطلع غبار آلود ہو جاتا۔ پھول پتیوں کا کیا تھا وہ تو ہر تبسم پر اڑا کرتی تھیں۔

کچھ دیر ایلی شہزاد کے سامنے بیٹھا رہا۔ پھر اس کے لئے وہاں بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا۔ شہزاد نہ جانے کہاں تھی۔ اس کے چہرے پر ایک وقار تھا۔ بے حسی تھی۔

ایلی اٹھ بیٹھا۔ ''اچھا اب میں جاتا ہوں فرحت انتظار کر رہی ہو گی۔''

''اچھا تو مل آ اسے۔'' اس نے سر اٹھائے بغیر ہی کہا۔ ''لیکن چائے یہاں پینا نیچے جانو بنا رہی ہے۔''

''اچھا تو میں ابھی آیا۔'' یہ کہہ کر وہ فرحت کی طرف چل پڑا۔

احساس عظمت

نیچے صفدر اندھیری کوٹھری کے ساتھ والا کمرہ صاف کر رہا تھا۔

''ہائیں ایلی ہے۔'' صفدر اسے دیکھ کر چونکا۔ ''چھٹی لے کر آئے ہو؟''

''دادی اماں۔'' صفدر نے دانت پیسے۔ ''وہ نہیں مرے گی وہ کبھی نہیں مرے گی وہ مرے تو میں پارٹی دوں گا۔ ضرور دوں گا ایمان سے مذاق نہیں۔''

ایلی کو صفدر کی بات اچھی نہ لگی۔

''آؤ۔ آؤ۔ بیٹھ جاؤ ایلی۔'' صفدر نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

ایلی بہت خوش تھا کہ محلے کا ایک بڑا لڑکا اسے اتنی اہمیت دے رہا تھا اور پھر وہ لڑکا جسے تھیٹر کی پارسی لڑکی سے عشق تھا۔

''تم مجھ سے کبھی نہیں ملتے ایلی۔ میرے پاس بھی آ کر بیٹھا کرو۔ اوروں کے پاس بیٹھتے ہو تو ہمارے پاس بیٹھنے میں کیا حرج ہے۔''

ایلی کو صفدر کی باتیں سمجھ میں نہ آ رہی تھیں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا وہ اس کے بازو عجیب انداز سے پھیلے ہوئے تھے۔ دائیں بازو پر نیلے حروف میں کچھ کھدا ہوا تھا۔

شاید اس پارسن کا نام ہوا یلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان نیلے حروف کے متعلق صفدر سے پوچھے لیکن اس میں ہمت نہ پڑی۔

اگر چہ صفدر اس وقت کمرے کی صفائی کرنے میں مشغول تھا۔ لیکن کبھی کبھار وہ رک جاتا اور اس کی آنکھوں میں چمک لہرا تی۔ سرخ بوندیاں اڑتیں۔ لیکن جلد ہی وہ چمک ماند پڑ جاتی اور محرومیت کے بادل چھا جاتے وہ ایک آہ بھرتا۔ اس کے ہونٹوں میں وہی جنبش ہوتی۔ ''حافظ خدا تمہارا'' کی جنبش، پھر وہ تڑپ کر مڑتا اور ایلی سے کہتا۔ ''ایلی تم شریف کے پاس بیٹھا کرتے ہو۔ لیکن میرے پاس تم کبھی نہیں آئے۔ کبھی نہیں۔ حالانکہ ہم دونوں کا رشتہ زیادہ قریبی ہے۔ اچھا۔ اچھا آج چائے اکٹھے پئیں گے۔''

عین اس وقت چوبارے سے شہزاد کی آواز آئی۔ ''ایلی''.....شہزاد کی آواز سن کر صفدر چونک پڑا اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کا بند بند رقص کر رہا ہو۔

''ایلی چائے تیار ہے آؤ بھی نا۔'' شہزاد کی آواز گونجی۔

شہزاد کی آواز سن کر سبھی چونک جاتے تھے۔ نہ جانے اس کی آواز میں کیا اثر تھا۔ اس کی آواز محلے والیوں کی آواز سے قطعی طور پر مختلف تھی جسے سن کر یوں محسوس ہوتا جیسی ویرانی میں کوئی اڑتا ہوا پنچھی تان اڑا گیا ہو، یا جیسے گھور گھٹا میں سورج کی کوئی کرن چمک گئی ہو۔ اس کی آواز سن کر محلے کے بزرگ بھی چونک پڑتے تھے۔ اور پھر کسی سے پوچھتے۔ ''یہ شہزاد ہے نا؟''

صفدر نے ایلی کی طرف محروم نگاہوں سے دیکھا۔ ''ہاں بھئی۔'' وہ بولا۔ ''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ کچھ بھی نہیں۔ کون کچھ کہہ سکتا ہے۔'' اس نے ایلی سے یا اپنے آپ سے کہا۔ ''اچھا۔'' وہ بولا۔ ''کبھی تم ہم دونوں اکٹھے چائے پئیں گے۔''

ایلی صفدر کے کمرے سے باہر نکلا تو فرحت کھڑی تھی۔ ''ایلی تو کب آیا؟ مجھے تو

پتہ ہی نہیں تھا کہ تو آیا ہے۔'' وہ حسرت بھری مسکراہٹ سے بولی۔ ''اگر میں شہزاد کی آواز نہ سنتی تو مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ تو آیا ہے چلو شکر ہے کہ ہم تیرا نام تو سن لیتے ہیں شہزاد کی زبان ہی سے سہی۔ چائے تو ہمارے یہاں بھی تیار ہے۔''

''مگر.....'' اس نے شہزاد کے چوبارے کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھ کر کہا ''تجھے فرصت مل جائے تو آئیو آئے گا نا۔ ضرور آنا۔'' فرحت کی آنکھوں میں نمی نمی سی دیکھ کر ایلی لرز گیا۔ وہ حیران تھا کہ وہ سب ایلی کی طرف سے اس قدر مایوس کیوں تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان کی ان کہی شکایات کا کیا جواب دے مگر ان جانے میں ایلی میں ایک احساس برتری لہریں لے رہا تھا۔ اسے اپنی عظمت کا احساس ہوا جا رہا تھا اگرچہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ احساس عظمت کس وجہ سے ہے اور وہ سب اس سے مایوس کیوں تھے اور ان کا انداز حسرت زدہ کیوں تھا۔ یہ سوچتا ہوا وہ شہزاد کی طرف چل پڑا۔

بے نیاز دوشیزہ

جب وہ داخل ہوا تو شہزاد اسی طرح بیٹھی مشین چلا رہی تھی اور اس کی نگاہ ریشمیں کپڑے پر جمی ہوئی تھی۔

''آ گئے تم۔'' اس نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ ''دیکھو تو کب سے چائے پڑی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

میز پر چائے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ چند ایک ساعت تو ایلی منتظر رہا کہ ابھی شہزاد آنکھ اٹھا کر اس کی دیکھے گی لیکن وہ جوں کی توں کام کرتی رہی۔ آخر وہ سوچنے لگا کہ آنکھ اٹھا کر دیکھنا نہ سہی لیکن اٹھ کر چائے تو بنائے گی مگر جلد ہی اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔

''اب پی بھی لو نا چائے۔'' وہ بولی۔ ''مجھے بھی ایک پیالہ بنا دو۔'' ایلی کے تمام سہانے خیال صابن کے بلبلوں کی طرح پھوٹ گئے۔

اس نے محسوس کیا جیسے گردوپیش دھندلا رہے ہوں۔ جیسے وہ گرا جا رہا ہو۔ بلندیوں سے نیچے کی طرف لڑھک رہا ہو وہ احساس برتری کافور ہو چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا ''میں چائے کا بھکاری تو نہیں جو میز پر رکھی ہے۔'' اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جائے اور اپنے آپ کو اس برتر اور بے نیاز دوشیزہ سے محفوظ کر لے، لیکن اٹھ کر بھاگنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ پھر دفعتاً اسے یاد آیا کہ اس نے کہا تھا کہ میرے لئے بھی بنا دو ایک پیالہ، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا۔ میرے لئے بھی بنا دو ایک پیالہ۔ اس ایک فقرے میں جادو تھا کتنی اچھی ہے شہزاد..... وہ محسوس کرنے لگا اور پھر چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی شہزاد چھم سے آنمودار ہوئی۔ ''چلو ایلی۔'' وہ بولی۔ ''میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

''یہاں جو بنی ہوئی ہے۔'' فرحت بولی۔ ''دونوں بیٹھ کر یہیں کیوں نہیں پی لیتے۔'' فرحت کے انداز میں طنز تھی۔

''یہاں نہیں۔'' شہزاد تن کر بولی۔ ''چائے کا مزا اکیلے میں آتا ہے۔''

''تو جبھی ایلی کو بلانے آئی ہو۔'' فرحت نے پھر وار کیا۔

''ہاں۔'' شہزاد نے قہقہہ لگایا۔

''مجھے بھی ساتھ لے چلو۔'' فرحت بولی۔

''نہ بھائی۔'' شہزاد نے جواب دیا۔

''معلوم ہوتا ہے شریف جاتے ہوئے ایلی کو تمہیں سونپ گیا ہے۔''

''ہاں۔'' شہزاد مسکرائی۔ ''وہ کہہ گئے ہیں کہ ایلی کو چائے پر ضرور بلایا کرنا۔''

''اوہ۔'' فرحت شہزاد کی دلیری پر گھبرا گئی اور ایلی چپ چاپ شہزاد کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

جب وہ شہزاد کے چوبارے میں پہنچے تو شہزاد حسب معمول مشین کے سامنے بیٹھ

کر بولی۔ ''ایک پیالہ مجھے بھی بنا دو۔'' اور خود کام میں مصروف ہو گئی۔

دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھا چائے پیتا رہا اور شہزاد کپڑے سینے میں منہمک رہی۔ چائے پی کر جب وہ نیچے اترا تو اندھیری کوٹھری میں صفدر کھڑا حسرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے جیسے ''حافظ خدا تمہارا'' گنگنانا بھول چکے ہوں۔ ایلی کو دیکھ کر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ہونٹوں پر ایک حسرت بھری مسکراہٹ آ گئی۔ نہ جانے وہ کیوں اس کی طرف حسرت سے دیکھتے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ چلا کر کہے۔ ''نہیں نہیں۔ میں نے خود اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پی ہے۔ میرے ساتھ میز پر کسی نے چائے نہیں پی۔'' لیکن اس میں اتنی جرات نہ تھی۔ چوگان میں عورتوں نے اس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

''اے ہے۔'' ایک بولی۔ ''ایلی آیا ہے۔''

''میں کہہ رہی ہوں۔ یہ کیا گورکھ دھندہ ہے۔'' چاچی بولی۔ ''دادی تیری اس طرف بیمار پڑی ہے۔ بہن تیری ادھر ہے تو اس ڈیوڑھی سے باہر نکل رہا ہے۔''

''ہائے چاچی۔'' دوسری نے کہا۔ ''آج کل کے لڑکے گھر پر کہاں بیٹھتے ہیں۔''

''نہ لڑکی۔'' چاچی نے پینترا بدلا۔ ''ہمارا ایلی ایسا نہیں۔ ہوگا کوئی کام آخر پڑ جاتا ہے اور وہ لڑکی۔'' اس نے کان سے منہ لگا کر کچھ کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

''دیکھ لو زمانے کے رنگ ہیں چاچی۔''

''یہی تو دیکھ رہی ہوں۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے مگر ہمارا ایلی ایسا نہیں۔''

کیا کروں

پھر رضا آ گیا..... ''ٹھیک ہے بابو اب کیوں ہمارے پاس آنے لگے تم۔ اب تو بس چوباروں میں بیٹھ کر چائے اڑتی ہے۔ لوگ بلا بلا کر پلاتے ہیں۔ مگر بابو جب اونچے چوباروں سے کوئی گرے تو ہڈی پسلی ایک ہو جاتی ہے ہاں۔'' اس نے اپنی لنگڑی ٹانگ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یقین نہ آئے تو یہ دیکھ لو۔''

''بکواس بند کرو۔'' ایلی نے بات مذاق میں ٹالنے کی غرض سے کہا۔

''کیسے کروں بند۔'' رضا ہنسنے لگا۔ ''اپنا تو کام ہی بکنا ہے۔ سنا امرتسر والوں کا کیا حال ہے۔ اب تو مزے ہیں نا۔''

رضا اسے چھیڑنے لگا۔

''بیٹھ جا۔'' وہ بولا۔ ''بیٹھ جا میاں۔''

''اونہوں۔'' ایلی نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا چل کہیں گھومیں پھریں۔ واہ دل خوش کر دیا رضا نے لاٹھی پکڑی اور چل پڑا۔ دیر تک وہ دونوں فصیل سے باہر گھومتے رہے پھر ایک درخت تلے بیٹھ گئے۔

''رضا۔'' ایلی بولا۔ ''میرا جی نہیں لگتا۔''

''جی لگ جائے بابو تو پھر بھی نہیں لگتا۔''

''کیا مطلب؟'' ایلی نے پوچھا۔

''سارے محلے میں تیری تسلیم کی باتیں ہو رہی ہیں۔''

''لیکن رضا تسلیم تو میرے سامنے نہیں آتی کئی جتن کر دیکھے۔''

''تسلیمیں سامنے نہیں آیا کرتیں ایلی۔ سامنے آ کھڑی ہوں تو پھر بات ہی کیا ہے۔'' رضا نے کہا۔ ''یہ تو ہوتا ہی ہے۔'' پھر ایلی امرتسر کی باتیں سناتا رہا اور رضا قہقہے مار کر ہنستا رہا۔

سیر کر کے جب وہ واپس آئے تو رضا سے رخصت ہو کر ایلی دادی اماں کی طرف گیا دروازے میں ہاجرہ کھڑی تھی۔ ''تو یہاں کیا کر رہا ہے۔'' وہ بولی۔ ''جا فرحت کی طرف دوڑ جا یہاں سے۔'' ''کیوں؟'' ایلی نے پوچھا۔

''کہا جو ہے تم سے۔'' وہ بولی۔ ''وہ اسی طرح بے ہوش پڑی ہے۔ آنکھیں

کھولنے کی سکت نہیں رہی۔اس کے پاس بیٹھ کر اپنا دل برا کرے گا تو۔جا فرحت تیرا انتظار کر رہی ہو گی۔"

وہ چپ چاپ فرحت کی طرف چل پڑا۔

شام کو جب وہ شہزاد کے چوبارے میں پہنچا تو چوبارے سے ملحقہ چھت پر پانچ چھ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور فرحت اور شہزاد چارپائی پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

"تو آ گیا ایلی۔" فرحت اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔"اچھا کیا تو نے کہ چلا آیا۔دادی اماں کی حالت اچھی نہیں۔نہ جانے کب۔"

.....رہ رک گئی۔"اماں تو کئی راتوں سے ادھر ہی رہتی ہیں، آج کی رات.....شاید مجھے بھی جانا پڑے۔اسی لئے میں نے یہاں چارپائیاں بچھوا دی ہیں تا کہ بچے اکیلے نہ رہیں۔ٹھیک ہے نا شہزاد....." "وہ ہے تیری چارپائی ایلی۔ وہ کونے والی۔"

شہزاد

سانپ اور سپیرا

رات کو شہزاد کی طرف دیکھے بغیر ایلی اپنی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا اور سوچ میں غرق ہو گیا۔ صحن میں چاندنی۔ چٹکی ہوئی تھی روپہلی چاندنی میں شہزاد کے دو بلوریں پاؤں کہیں رکھے ہوئے تھے اور سیاہ جالی دار دوپٹے میں اس کی دودھیا پیشانی پر ایک سیاہ بیر بہوٹی چمٹی ہوئی تھی۔ دو نوکیلی آنکھیں ڈول رہی تھیں۔ گھبرا کر ایلی نے دیوار کی طرف منہ موڑ لیا اور کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد دادی اماں کی طرف سے ہاجرہ نے فرحت کو آواز دی۔ ''ادھر آنا۔ جلدی۔''

''خدا خیر کرے۔'' فرحت نے گھبرا کر کہا اور ملحقہ کوٹھا پھلانگ کر دادی کی طرف چلی گئی۔

فرحت کے جانے کے بعد دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ نہ جانے شہزاد بیٹھی کیا کر رہی تھی۔ ایلی نے شہزاد کی طرف نہ دیکھنے کا عزم کر رکھا تھا مگر اس کے باوجود اس کی نگاہوں تلے سیاہ جالی دار دوپٹے کا پلو اڑ رہا تھا۔ شفاف پیشانی پر سیاہ بیر بہوٹی رینگ رہی تھی۔ ہر پانچ منٹ کے بعد اسے احساس ہوتا کہ وہ شہزاد کے متعلق سوچ رہا ہے پھر وہ گھبرا کر اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش میں لگ جاتا۔

''سو گئے ایلی۔'' قریب ہی شہزاد کی آواز سن کر وہ چونک پڑا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ''نہیں تو جاگ رہا ہوں۔''

''اوہ..... میں سمجھی سو گیا ہے۔ لیکن یوں چپ چاپ کیوں پڑا ہے تو'' وہ بولی ''اور کیا اٹھ کر ناچوں۔'' ایلی نے جل کر کہا۔

وہ بچوں کی طرح ہنسنے لگی۔ ''ناچ تجھے کون منع کرتا ہے۔''

''اکیلے میں تو ناچا بھی نہیں جاتا۔'' وہ بولا۔

''تو کیا اکیلا ہے۔'' شہزاد نے اشارتاً اسے امرتسر یاد دلانے کی کوشش کی۔

''اکیلا ہی تو ہوں۔'' ایلی نے لمبی آہ بھری۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ ''اوہ میں بھی امرتسر یاد آ رہا ہے تجھے۔''

''امرتسر؟'' وہ گھبرا گیا۔

''تسلیم۔'' شہزاد نے جھک کر اسے آداب کیا اور پھر ہنسنے لگی۔

ایلی کا منہ فق ہو گیا۔ نہ جانے کیوں وہ سمجھتا تھا کہ شہزاد امرتسر اور تسلیم کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔

''کبھی تسلیم سے ملاقات بھی ہوئی ہے؟'' شہزاد نے اس کے قریب آ کر پوچھا اور پھر اس کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

ایلی کے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں اسے محسوس ہونے لگا جیسے گرمی کی ایک لہر اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ان جانا اضطراب اس پر چھائے جا رہا تھا۔ ایک سرخ دھندلکا اس کی کنپٹیوں میں تھرک رہا تھا۔ صحن میں زرد چاندنی اور گدرے سایوں کی عجیب سی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ پاس ہی چوبارے میں اندھیرا رینگ رہا تھا۔ مسجد کے گنبد کے اوپر چمگادڑیں چیخ رہی تھیں۔

''یاد آتی ہے تمہیں۔'' شہزاد نے ایلی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''جبھی یوں چپ چاپ پڑا رہتا ہے تو۔''

''نہیں تو۔'' وہ بولا۔

شہزاد اپنے حنا مالیدہ ہاتھوں سے کھیل رہی تھی۔ سفید ہاتھوں پر حنائی رنگ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''نہیں نہیں۔'' وہ بولا۔

''اچھا۔'' وہ ہنسی۔ ''اگر وہ یاد بھی نہیں آتی تو پھر فائدہ ہی کیا ہوا؟''

''فائدہ۔'' اس نے شہزادکی اڑتی ہوئی لٹ کی طرف دیکھا۔

''اچھی محبت ہے یہ۔'' وہ بولی۔

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جائے وہ قرب نہ جانے کیا کر رہا تھا جیسے اس چھیڑ رہا ہو۔ اس کی قوت عمل دھندلائی جا رہی تھی، نہ جانے قرب کی وجہ سے یا کسی ان کہے ڈر سے جو اس کی نسوں میں دھنکی کی طرح بج رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اس نے بات کرنے کی کوشش کی تو اس کی آواز کی لرزش راز فاش کر دے گی۔

''میں پانی پی لوں۔'' ایلی نے گھبرا کر کہا۔

''میں پلاتی ہوں تمہیں پانی۔'' شہزاد اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایلی کا بھاگ جانے کا یہ بہانہ بھی بے کار ہو کر رہ گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا گھڑے کے پاس شہزاد گلاس میں پانی ڈال رہی تھی۔ اس کے گرد چاندنی اور اندھیرے کی بساط بچھی ہوئی تھی اور اس بساط پر ملکہ بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر اڑتے ہوئے بالوں کا تاج تھا۔ ''یہ لو۔'' شہزاد کا حنا مالیدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھا۔ ناگ نے پھن اٹھایا۔ ایلی جھجک کر پیچھے ہٹا۔

''لو بھی'' ہاتھ اور قریب آ گیا ایلی کا جی چاہا کہ پانی کے گلاس کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑے اور پھر پھر ..... مگر پھر کے متعلق اسے کچھ معلوم نہ تھا..... ایک سرخ دھندلکا۔

چخ چخ۔ ایک چمگادڑ کہیں قریب سے ایلی کی طرف لپکی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ شہزاد نے گلاس چھوڑ دیا ایلی شرابور ہو گیا۔ شہزاد کی سریلی ہنسی سے فضا گونجنے لگی۔

''بالکل ہی مجنوں بن گئے۔'' وہ چلائی۔ ''لاؤ میں پونچھ دوں۔'' وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھی۔ سرخ ناگ پھن پھلائے پھر اس کی طرف لپکا بوکا ایک ریلا آیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ سرخ دیوانگی اس پر مسلط ہو گئی۔ اس نے لپک کر اس رنگین سانپ کو ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ جیسے وہ سپیرا ہو۔ اسے اپنی طرف کھینچا۔ نہ جانے محض جنون کی

وجہ سے۔محبت سے۔نفرت سے یا اس خوف کی وجہ سے جو اس پر مسلط و محیط تھا۔اس کی دیوانگی اور بھی شدید ہوگئی۔اس نے ایک تازہ جھٹکا دے کر دیوانہ وار اسے اپنی طرف کھینچا۔یوں بے دردی سے کھینچا۔جیسے شہزاد محض ایک رنگین گڑیا ہو۔شاید وہ اسے دانتوں سے کاٹنا چاہتا تھا تاکہ کاٹے جانے سے پہلے اس کی گردن چبالے اور اپنے آپ کو محفوظ کرلے لیکن اس کے گرم لمس سے ایلی کے ہونٹ جلنے لگے اور ان جانے میں اس نے اسے دیوانہ وار چومنا شروع کردیا۔شہزاد چارپائی پر یوں گر چکی تھی جیسے ایک بار پھر مونگیا گٹھڑی میں تبدیل ہوگئی ہو۔

''ایلی تم.....؟'' وہ ہونک رہی تھی۔

ایلی کی نگاہ میں وہ زرد چاندنی سرخ ہوئی جارہی تھی۔جیسے فضا میں گلال کی پچکاریاں چل رہی ہوں۔

عین اس وقت ملحقہ کوٹھے سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔فرحت چلاتی ہوئی آ رہی تھی۔''تم سو گئے کیا؟''

فرحت کی آواز سن کر وہ خونیں طلسم ٹوٹ گیا۔ایلی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔گٹھڑی لپک کر کھڑی ہوگئی اور ایلی لیٹ کو یوں چپ چاپ پڑ گیا۔جیسے عرصہ دراز سے سو رہا ہو۔

''تم آ بھی گئی۔''شہزاد نے کہا۔

''اماں نے بھیج دیا۔''فرحت بولی۔

''کیا حال ہے اب۔''

''اچھا نہیں۔شاید آج کی رات.....''

''بیچاری کی جان چھٹے۔''

''میں سمجھی تم سو چکے ہوگے۔''فرحت نے کہا۔

''نہیں تو۔''شہزاد بولی۔''ابھی تو جاگ رہے ہیں۔''

''اور ایلی تو غالباً سو چکا ہے۔'' فرحت نے ایلی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ابھی تو باتیں کر رہا تھا۔ مجھ سے۔'' شہزاد کی آواز میں کسی قسم کی لرزش نہ تھی۔ وہ یوں کوٹھے پر ادھر ادھر گھوم رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اگر۔ لیکن

ایلی پسینے میں شرابور تھا۔ اسے اپنے کئے پر پشیمانی ہو رہی تھی۔ میں نے کیا کر دیا۔ کیوں کیا۔ اگر شہزاد نے فرحت سے کہہ دیا تو۔ اگر اس نے شریف کو بتا دیا تو وہ کیا کہے گا۔ مجھ سے نفرت کرنے لگے گا۔ دونوں مل کر تمسخر سے ہنسیں گے۔ اس تمسخر کو محسوس کر کے اس کا سانس رک گیا۔

لیکن شاید شہزاد کسی کو نہ بتائے۔ شاید وہ اس راز کو چھپا لے۔ ابھی تک تو اس نے فرحت سے اس بارے میں بات نہ کی تھی۔ شاید وہ موقعہ کی تلاش میں تھی کہ کب ایلی کہیں جائے اور وہ ایلی کی حماقت کا قصہ بیان کرے۔ فرحت اور ہاجرہ سن کر کیا کہیں گی۔ کہیں گی۔ آخر بیٹا کس کا ہے۔ اس خیال پر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

لیکن شہزاد کا رویہ بے نیازی اور بے پروائی کا مظہر تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے اس رویے کی وجہ سے ایلی کے دل میں امید کی کرن روشن ہو گئی۔ شاید وہ کسی کو نہ بتائے۔ لیکن پھر اسے خیال آتا اگر نہ بھی بتائے تو بھی وہ اپنے دل میں اسے ذلیل سمجھے گی۔ اس کی اس مذموم حرکت پر رنجیدہ ہو گی۔ ممکن ہے اب کبھی اس کے قریب نہ آئے اور آئے بھی تو نفرت سے ناک سکیڑ لے۔ کیا وہ ہمیشہ کے لئے شہزاد کی چھم سے محروم ہو جائے گا۔ کیا وہ اسے دیکھ کر کبھی نہ مسکرائے گی۔ اس کی آنکھوں میں ننھی بتیاں روشن نہ ہوں گی اور وہ گلال بھری پچکاری..... نہیں نہیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ شہزاد فرحت سے شکایت کر دے۔ ہاجرہ سے کہہ دے۔ شریف سے کہہ دے۔ جس سے جی چاہے کہہ دے مگر اپنا انداز نہ بدلے ہاں ہاں۔ میں اس

سے معافی مانگ لوں گا۔ ہاتھ جوڑ دوں گا اور جب وہ معاف کر دے گی تو منت کر کے کہوں گا۔ ''میری ایک بات مان لو خدا کے لئے۔ صرف ایک بات۔ اپنے ہاتھوں پر مہندی نہ لگایا کرو اور اگر اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنا ہاتھ میرے اس قدر قریب نہ لایا کرو۔''

چارپائی پر پڑے پڑے وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے سر پر اندھیرے کا ایک بہت بڑا ٹکڑا منڈلا رہا تھا اور شیش محل کی سب سے اونچی منزل مُیالی چاندنی میں اپنی بے نور کھڑکیوں سے اس کی طرف گھور رہی تھی۔ قریب ہی شہزاد فرحت سے باتیں کرتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

شہزاد کی ہنسی سن کر وہ چونک پڑا۔ وہ ہنس کیوں رہی تھی۔ وہ باتیں کیوں کر رہی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ شاید وہ اس کی اس حرکت کو درخور اعتنا نہ سمجھتی ہو۔ اس خیال پر وہ کانپ گیا۔ اگر اس نے اس بات کو اہمیت نہ دی تو..... اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور وہ اضطراب میں کروٹیں بدلنے لگا۔

''لو یہ اور دیکھو۔'' شہزاد ہنسی۔ ''ویسے سویا ہوا ہے لیکن کروٹیں لئے جا رہا ہے۔''

فرحت نے سنجیدگی سے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کبھی خیال نہیں کیا سوتے میں ہمیشہ کروٹیں لیتا ہے۔''

''اچھا۔'' شہزاد کی آواز میں طنز تھی۔ سوتے میں جاگتے کی سی حرکتیں کرتا ہے اور جاگتے میں سوتے کی سی۔ عجیب بات ہے۔''

فرحت شہزاد کی بات سمجھ نہ سکی۔ البتہ ایلی کی پیشانی پر چند قطرے نمودار ہوئے اور وہ سوچنے لگا کہ شہزاد کی آواز میں کتنی طنز تھی۔ ضرور اس نے اس کی اس حرکت کا برا مانا تھا۔ ضرور برا مانا ہو گا۔ اب کیا ہو گا۔ کیا وہ اس گھر میں آنے سے محروم کر دیا جائے گا۔ ساتھ ہی اسے خیال آتا کہ شکر ہے اس نے کچھ تو مانا اسے اچھا نہ سہی برا سہی درخور اعتنا تو سمجھا۔ اگر وہ کچھ بھی نہ سمجھتی تو..... اس خیال پر اسے خوشی تو ہوتی،

مگر پھر وہی فکر سوہان روح ہو جاتا۔ نہ جانے اب وہ کیا کرے گی۔

آہستہ آہستہ فرحت اور شہزاد کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں اور ان کی باتوں میں وقفے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

وہ چونک کر جاگ پڑا۔ اس نے مڑ کر چوری چوری فرحت اور شہزاد کی چارپائیوں کی طرف دیکھا۔ انہیں چپ چاپ پڑے دیکھ کر وہ پانی پینے کے بہانے اٹھ بیٹھا۔ فرحت چارپائی کے ایک پہلو پر سمٹی ہوئی پڑی تھی۔ اس سے پرے شہزاد چارپائی پر یوں بچھی ہوئی تھی جیسے پلنگ پوش بچھا ہوتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ ایک ہاتھ سانولے والی چارپائی پر اپنی ننھی بچی صبیحہ پر پڑا تھا۔ جیسے تھپکتے تھپکتے سو گئی تھی۔ ایلی نے شدت سے محسوس کیا کہ کاش وہ صبیحہ ہوتا اور شہزاد کا ہاتھ اسے تھپکتا۔

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ ہاتھ اسے تھپک رہا ہو اس کے بدن میں چیونٹیاں چلنے لگیں۔ سرخ ناگ پھن اٹھا کر اس کی طرف لپکا۔ ایلی کسی شدید جذبہ سے متاثر ہو کر شہزاد کی طرف بڑھا۔ اس کا جی چاہتا کہ اس رنگین پھن سے لپٹ جائے اور پھر ڈسے جانے کے بعد اس خوابیدہ حسینہ پر گر کر ڈھیر ہو جائے۔ لیکن عین اس وقت فرحت نے کروٹ لی اور وہ گھبرا کر رک گیا اور پھر چپ چاپ اپنی چارپائی پر جا لیٹا۔

ندامت یا ڈر

اگلے روز ایلی سارا دن اس کوشش میں لگا رہا کہ شہزاد کے روبرو نہ جائے۔ وہ شہزاد سے ڈرتا تھا۔ صبح سویرے ہی اٹھ کر وہ باہر نکل گیا اور کوٹلی جا کر قبرستان اور تالاب کے گرد بے مصرف گھومتا رہا۔ واپس آ کر چپکے سے اندھیری ڈیوڑھی سے گزر کر سیدھا فرحت کے گھر آ پہنچا حالانکہ عام طور پر وہ ہمیشہ شہزاد کے مکان سے گزر کر فرحت کی طرف آیا کرتا تھا۔ پھر جب دوپہر کو وہ گھر بیٹھا فرحت سے باتیں

کرنے میں منہمک تھا تو سیڑھیوں سے طبلے کی تھاپ سنائی دی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اسے بھول گیا کہ وہ کہہ کیا رہا تھا۔ کیا کہنا چاہتا تھا۔ فرحت اور ہاجرہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ اٹھ بیٹھا "اچھا میں ہو آؤں۔" چھم سے شہزاد اس کے قریب آ رکی۔ ایلی نے نگاہیں جھکا لیں۔

"ایلی ہے۔" شہزاد نے لاپروائی سے کہا۔ "نظر ہی نہیں آیا آج کہاں رہا۔" وہ ہنسی اور فرحت کی طرف دیکھنے لگی۔

ایلی چپکے سے وہاں سے سرک گیا۔

چوگان ویران پڑا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو چوگان میں کھیل رہے تھے، مٹی کے پتلے معلوم ہو رہے تھے۔ پرانی حویلی کی خمیدہ لال اینٹیں کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اسے گھور رہی تھی۔ کیپ کی کھڑکی کی چق لٹی لٹی دکھائی دے رہی تھی۔ کنوئیں کے پاس رہنے والی کشمیرن یوں بیٹھی تھی جیسے کسی نے چوکی پر زرد رنگ کے گوشت کا ڈھیر لگا رکھا ہو۔

پھر وہ دادی اماں کے پاس جا بیٹھا۔ مگر وہ خاموش چارپائی پر پڑی تھی۔ "تو آ گیا۔" سیدہ نے اس کی طرف دیکھا۔ "نہیں نہیں۔" وہ چلائی۔ "جا۔ جا کر کھیل۔ یہاں نہ بیٹھ بیمار کے پاس نہیں بیٹھا کرتے۔" کچھ دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا پھر گھبرا کر باہر نکل آیا۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

شام کو جب وہ فرحت کے ساتھ شہزاد کے کوٹھے پر سونے کے لئے گیا تو اس نے جھکی جھکی آنکھوں سے محسوس کیا کہ شہزاد مسکرا رہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز کی دھار تھی۔ نفرت بھری مسکراہٹ۔

"تو سبھی یہیں ہے ایلی؟" وہ بولی۔ "میں سمجھی چلا گیا ہے واپس امرتسر۔"

"نہیں تو۔" شہزاد کی طرف دیکھے بغیر اس نے جواب دیا۔

"کیا ہوا ہے تجھے؟" وہ بولی۔

''کچھ بھی نہیں۔'' ایلی نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا اور چپکے سے چارپائی پر لیٹ گیا۔

مہر سکوت

اگلے روز وہ بہت دیر سے بیدار ہوا۔ اس نے کوٹھے پر چاروں طرف دیکھا۔ فرحت جا چکی تھی۔ شہزاد کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ صرف صبیحہ پڑی سو رہی تھی۔ موقعہ کو غنیمت جان کر وہ جلدی سے اٹھا تا کہ شہزاد کے آنے سے پہلے ہی فرحت کی طرف چلا جائے۔ جب وہ دروازے میں داخل ہوا تو کسی نے زور سے اس کی قمیض پکڑ لی۔ ''کہاں جاتا ہے تو؟ آ ادھر چائے پی کر جانا۔'' شہزاد کو دیکھ کر اسے پسینہ آ گیا۔

''نہیں نہیں۔'' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''ادھر آ کر بات کرنا۔'' وہ اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لے گئی اور کرسی پر بٹھا کر خود بے نیازی سے میز پر چائے کے برتن رکھنے میں یوں مصروف ہو گئی جیسے ایلی سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو جیسے وہ اسے پکڑ کر لائی نہ ہو۔

دیر تک وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر وہ اس کے سامنے آ بیٹھی۔

''پی چائے۔'' وہ یوں گھور کر بولی جیسے بچے کو دوا پلا رہی ہو۔ ''پی سانپ سونگھ گیا ہے تجھے کیا۔''

''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''سانپ سونگھ گیا ہے۔''

''اچھا۔'' وہ ہنسی۔ ''پھر تو تو بڑا ڈھیٹ ہے کہ اب تک اچھا بھلا چلتا پھرتا ہے۔''

''لوگ نہ جینے دیتے ہیں نہ مرنے۔'' وہ بولا۔

''اتنی پروا کرتا ہے تو لوگوں کی۔''

وہ لاجواب ہو گیا۔ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''ایلی۔'' وہ بولی۔ ''وہ کیا حماقت تھی۔ مجھے تجھ سے ایسی توقع نہ

تھی۔ایلی۔"اس نے آہستہ سے کہا۔"تجھے شرم نہ آئی۔"

ایلی کی ناک پر پسینہ آ گیا اس کی آنکھیں اور بھی جھک گئیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔"اور پھر ایسی بات کرے۔تو ایلی۔"وہ بولی"کوئی اور کرتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔"

ایلی کے دل میں آیا کہ اٹھ کر بھاگ جائے مگر اس میں ہمت نہ تھی پھر اس نے سوچا کہ پاؤں پر گر کر معافی مانگ لے لیکن پاؤں پر گرنا بھی تو مشکل تھا۔اس نے شہزاد کے پاؤں کی طرف دیکھا کتنے خوبصورت تھے۔جیسے سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہوں۔

شہزاد نے کروٹ سی لی اور اس کا ایک بازو کرسی سے نیچے لٹکنے لگا۔"مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی۔"اس نے اپنی بات دہرائی۔اس رنگین ناگ نے پھن اٹھایا۔ایلی کی نگاہیں اوپر اٹھ گئیں۔اس کے چہرے کی زردی سرخی میں بدل گئی۔وہ اٹھ کر شہزاد کی طرف لپکا اور اس کے لٹکتے بازو سے یوں لپٹ گیا۔جیسے کوئی نیولا سانپ سے لڑ رہا ہو۔

اس نے شہزاد کو چپ کرانے کے لئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر نہ جانے کیا محسوس کر کے وہ شہزاد کے بلوریں پاؤں سے لپٹ کر اپنے ہونٹ ان پر ملنے لگا۔

"شہزاد۔شہزاد۔"وہ گنگنایا۔"مجھے تم سے محبت ہے۔"

لیکن ایلی دیوانہ وار اس کے پاؤں سے لپٹا رہا۔آہستہ آہستہ شہزاد کی مدھم پڑتی گئی۔

"مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔مجھے تم سے....."

ایلی کی آواز بلند ہوتی گئی۔حتیٰ کہ شہزاد نے بڑھ کر ایلی کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی۔اس گھڑی کے پٹ از سر نو بند ہو گئے۔اس کی آنکھیں جھک گئیں۔مژگان نے ان سیاہ شراروں کو ڈھانپ لیا اور اس کے بازو فضا میں معلق ہو کر رہ گئے۔

ایلی نے جواب میں یہ بات صرف اس لئے کہی تھی کہ اس کے علاوہ اور کوئی جواب دینا ممکن نہ تھا۔معافی مانگ لینے کا امکان تو تھا۔مگر اس میں اس کی بے عزتی تھی اگر وہ معافی مانگ لیتا تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ وہ حرکت اس نے کسی مذموم خیال سے کی تھی۔سستی عیش وعشرت کے خیال سے یا رنگین وقت کٹی کے لئے۔اس کے علاوہ اس نے محسوس کیا تھا کہ اگر معافی مانگ لی تو وہ شہزاد سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔کس منہ سے اس کے روبرو جایا کرے گا۔بے شک اسے شہزاد سے بے پناہ دلچسپی تھی۔شہزاد کو دیکھ کر وہ مضطرب ہو جایا کرتا تھا۔مگر یہ اضطراب بے نام اور بے مقصد تھا۔اس نے کبھی شعوری طور پر شہزاد سے محبت کرنے کی آرزو محسوس نہ کی تھی۔نہ ہی اس نے کبھی سوچا تھا کہ شہزاد سے وہ اس قسم کا تعلق پیدا کر سکتا ہے۔الٹا وہ تو اسے اس قدر بلند اور عظیم ہستی سمجھتا تھا کہ اس کے قرب کی آرزو دل میں رچانے کے خیال ہی سے گویا اس کی جان نکلتی تھی۔

اگر اس مُیالی چاندنی میں وہ تنہائی میں اس کے قریب نہ بیٹھتی یا اس کے ہاتھوں پر حنائی رنگ نہ ہوتا یا حنا میں وہ بو نہ ہوتی جو ایلی کو مشتعل کر دیا کرتی تھی یا وہ ہاتھ ازراہ اتفاق ناگ کی طرح پھن نہ اٹھاتا اور ایلی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ اسے اپنی حفاظت کرنی ہے تو وہ کبھی شہزاد کو اپنی گرفت میں نہ لیتا۔

اگر شہزاد بار بار اسے نہ بلاتی تو اس کی گردن جھکی ہی رہتی اور آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی حماقت کا احساس ہو جاتا یا اگر شہزاد تنہائی میں اس سے اس کے احمقانہ رویہ کے متعلق استفسار کر کے اسے لاجواب نہ کر دیتی تو وہ اپنی گزشتہ حماقت کا اعادہ نہ کرتا اور اس کی زندگی میں شہزاد کا رنگین بھنور پیدا ہی نہ ہوتا اور اس کی داستان حیات سراسر مختلف ہوتی۔

ان چھوٹی چھوٹی تفصیلات نے مل کر ایلی کی زندگی کے دھارے کا رخ پھیر دیا۔

ڈوبتے کی طرح ایلی کے لئے وہ رنگین ہاتھ تنکا بن گئے اور وہ ان رنگین ناگوں سے دیوانہ وار چمٹ گیا ان ہاتھوں سے چمٹنے کے لئے صرف ایک جواز ہو سکتا تھا۔ صرف ایک ''مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔'' اپنی لغزش پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ اس جملے کو دہراتا گیا حتیٰ کہ وہ کمرہ وہ مکان اس کے اس جملے سے گونجنے لگے۔ ''مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔'' نہ جانے اس الفاظ نے یا اس بڑھتی ہوئی شدت نے جس سے وہ ادا کئے جاتے تھے یا ان کی ادائیگی کے تواتر نے شہزاد کی عقل وخرد کو مغلوب کر دیا یا ممکن ہے کہ اس میں قوت دماغ باقی نہ رہی ہو۔ ممکن ہے شہزاد ان الفاظ کی بھوکی ہو اور شریف نے ہمیشہ اسے اس جملے سے محروم رکھا ہو۔ اس لئے شہزاد نے انجانے میں ایلی کو وہ الفاظ کہنے پر مجبور کر دیا ہو۔ شاید شہزاد اپنے خاوند کے رویے سے اکتا چکی ہو، جو ہر وقت ٹکٹکی لگائے چھت کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ جو کبوتر کی سی آنکھیں بنا کر لیٹا رہتا تھا جو ہر بات پر آہ بھرتا تھا اور انور کی محبت کے خود ساختہ فریب میں ڈبکیاں لینے میں لذت محسوس کرتا تھا اور شہزاد اس کے قریب اس بات کی تمنا میں گھلتی رہتی تھی کہ وہ ایک نظر اس کی طرف دیکھے۔ ایک بار ماضی کے دھندلکے سے نکل کر حال کی طرف متوجہ ہو۔ ممکن ہے کہ شہزاد شریف کی سچی محبت کے اکتا دینے والے تسلسل سے بیزار ہو گئی ہو اور اس کے دل میں یہ آرزو ان جانے میں بیدار ہو چکی ہو کہ وہ بھی کسی کی انور بن جائے۔ بہر صورت اس کی کوئی بھی وجہ ہو نتیجہ یہ ہوا کہ شہزاد کو فریب دینے کے بعد ایلی نے ان جانے میں اپنے آپ کو فریب دینا شروع کر دیا اس نے حقائق کو اپنے خود ساختہ جذبات کے ایندھن میں جلا جلا کر سرخ کر لیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اسے شہزاد سے محبت ہے۔

گودی کا گیند

اس روز وہ سارا دن شہزاد کے قدموں میں بیٹھا روتا رہا۔ ''مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ میں نے بار بار چاہا کہ اظہار محبت نہ کروں۔ تمہیں

ناراض نہ کروں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم ناراض ہو جاؤ گی اور تم ناراض ہو جاؤ تو پھر زندگی میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔ شہزاد تم ناراض تو نہیں۔ شہزاد۔ بولو تم خاموش کیوں ہو۔ میں تمہارے قابل نہیں شہزاد میں تمہارے قریب آ جاؤں تو تم میلی ہو جاتی ہو۔ تم چاند ہو شہزاد اور میں بے وقوف بچہ۔ میں تمہارے قابل کہاں۔ مجھے برداشت کرو گی شہزاد۔ بولو شہزاد۔"

شہزاد حیرانی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ ابتدا میں تو اس کی حیرانی میں بیگانگی کا عنصر غالب تھا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ بے تکی باتیں وہ احمقانہ شدت۔ وہ بے مصرف پگلا پن جو ایلی کی باتوں اور چہرے سے ہویدا تھا اس کے دل پر نہ جانے کیا اثر پیدا کر گیا۔ ایلی کی بے تکی باتیں اس کے کانوں سے داخل ہو کر چہرے پر رینگنے لگیں گالوں پر سرخی بن کر جھلکنے لگیں آنکھوں سے پرنم مستی بن کر جھانکنے لگیں۔

"تم میری حماقت کسی کو بتاؤ گی تو نہیں شہزاد۔ میری دیوانگی اپنے تک محدود رکھو گی نا۔ وعدہ کرو شہزاد، اگر تم نے کسی سے کہہ دیا تو میرا کیا ہوگا۔ پھر میں اس گھر میں کیسے آ سکوں گا اور..... تم سے دور رہ کر زندگی کیسے کٹے گی۔ شہزاد غصہ نہ کرنا۔ میں مجبور ہوں شہزاد۔"

شہزاد کے چہرے پر حیا کی سرخی جھلکنے لگی۔ اس کی آنکھیں جھکنے لگیں۔ اس کی ناک پر پسینہ آنے لگا اور پھر اس کے بازو بے جان ہو کر لٹکنے لگے جیسے سپردگی کے شدید جذبے سے شل ہو چکے ہوں۔

مگر ایلی کو یہ احساس نہ تھا کہ اس کے منہ پر حیا کیوں جھلک رہی ہے۔ اس کی ناک پر پسینہ کیوں موتیوں کی طرح ابھرتا آ رہا ہے اور اس کے بازو لٹک کیوں رہے ہیں۔ وہ ابھی تک زینے کی پہلی سیڑھی پر ہی قدم جمانے کی جدوجہد میں دیوانہ وار مصروف تھا۔

"تم بتاؤ گی تو نہیں شہزاد..... تم مجھے معاف کر سکو گی۔ میں تمہیں دور سے

دیکھا کروں گا۔دور سے بس۔اتنا تو تم برداشت کرلوگی۔نا۔"

ایلی عورت سے واقف نہ تھا اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی بے تکی باتوں نے شہزاد کو کھوکھلا کر دیا ہے۔اسے احساس نہ تھا کہ تمام کا تمام زینہ گر کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو چکا ہے اور پہلی سیڑھی پر قدم جمانے کی کوشش میں کھوئے رہنا بیکار ہے۔ اسے احساس نہ تھا کہ وہ لٹکتے ہوئے رنگین ناگ اس کی اہڑ گرفت کے لئے منتظر تھے۔بے تاب تھے اور وہ ڈولتی ہوئی پرنم شربتی آنکھیں اس انتظار میں کھلی ہوئی تھیں کہ کوئی لمس انہیں بند کر کے راحت بھرا سکون بخش دے اور وہ رنگین گھڑی جو ہر لحہ بند ہوئی جا رہی تھی اس بات کی خواہش مند تھی کہ کوئی اسے اٹھا کر گودی کا گیند بنا لے۔

اسے ان باتوں کا احساس بھی کیسے ہو سکتا تھا۔وہ بیچارہ عورت اور محبت کی دنیا کی دہلیز سے بھی واقف نہ تھا۔اس کا مقصد تو صرف اس قدر تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو بچا لے اپنی حماقت کو نشر نہ ہونے دے اپنے خود ساختہ راز کو محفوظ کر لے۔

عین اس وقت اگر ہاجرہ نہ آ جاتی تو نہ جانے وہ دونوں کب تک یوں ہی بیٹھے رہتے۔ہاجرہ کے پاؤں کی چاپ سن کر اس منتظر مونگیا گھڑی کا طلسم ٹوٹ گیا۔وہ اچھل کر اٹھ کر بیٹھی۔

"اچھا تو چائے۔بناؤں تیرے لئے۔" وہ بولی۔

"چائے۔" وہ گھبرا گیا۔چائے کی تو بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔" شہزاد بولی۔"اب تو چائے پی کر ہی جانا۔"

ہاجرہ کے آنے پر شہزاد کا انداز ہی بدل گیا وہ یوں ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرنے لگی جیسے کوئی بچی انتہائے معصومیت میں اظہار مسرت کرتی ہے۔ایلی چپکے سے اٹھ بیٹھا اور بن بتائے چوری سے باہر نکل گیا تا کہ کوئی اسے روک نہ لے۔جوں جوں وہ شہزاد کے چوبارے سے دور ہوتا گیا توں توں اس کے دل میں ازسرنو یہ ڈر

پیدا ہوتا گیا کہ شہزاد اماں کو وہ بات نہ بتا دے شکایت نہ کر دے۔ اگر اس نے شریف سے کہہ دیا تو نہ جانے اس نے اسے معاف بھی کیا ہے کہ نہیں۔

فرار

باہر جا کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس امرتسر چلا جائے گا تا کہ پھر شہزاد کے سامنے جانے کا خدشہ نہ رہے۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنی تمام چیزیں اکٹھی کیں اور پھر سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکلا۔ صحن میں فرحت ہنڈیا پکا رہی تھی۔ ''میں جا رہا ہوں فرحت۔'' وہ بولا۔

''جا رہا ہے تو کیا واقعی جا رہا ہے۔'' وہ بولی۔ ''کہاں جا رہا ہے تو؟.....

ہائیں۔ اتنی جلدی۔'' وہ حیران رہ گئی۔ ''تمہیں تو ابھی چار دن اور رہنا تھا۔''

''نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ ابھی۔'' ایلی بولا۔

''آخر بات کیا ہے؟'' فرحت نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' ایلی نے جواب دیا۔

''کسی بات سے ناراض ہو گیا ہے کیا؟''

''اونہوں۔''

''نہ جانے تو ہم سے کیوں ناراض رہتا ہے۔ ایلی۔ ہمارا کیا قصور ہے؟''

''نہیں تو۔'' وہ گھبرا کر بولا۔

''تو کیا شہزاد نے کہا ہے کچھ؟''

''میں کہتا ہوں۔'' وہ چڑ کر بولا۔ ''کچھ بھی نہیں۔ کسی نے کچھ نہیں کہا مجھ سے۔''

''تو میں شہزاد کو بلاؤں۔ وہی تمہیں روک سکتی ہے۔'' فرحت نے مخلصانہ طور پر کہا۔

''نہیں نہیں۔'' شہزاد کا نام سن کر وہ ڈر گیا۔ ''مجھے امرتسر سے خط آیا ہے۔''

''خط آیا؟''

''ہاں میرا دوست بیمار ہے۔''

''اوہ۔'' اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''تو پہلے کہا ہوتا مجھ سے۔''

''اچھا تو میں چلتا ہوں۔''

''لیکن اماں سے تو مل کر جا اور تیری دادی اماں۔ وہ بھی تو بیمار ہے اس کی حالت۔''

یہ کہہ کر وہ چپکے سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ اسے ڈر تھا کہ راستے میں اس کا کوئی دوست نہ مل جائے۔ اگر رضا مل گیا تو غضب ہو جائے گا۔ وہ اسے تنگ کرے گا۔ لیکن خوش قسمتی سے چوگان میں بچوں کے سوا کوئی نہ تھا اور رضا سے بچنے کے لئے وہ ایک اور راستہ اختیار کر سکتا تھا۔

.....ریل میں بیٹھے ہوئے وہ چھپی چھپی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس روز دنیا ہی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ سبزہ گویا نئے انداز سے لہرا رہا تھا۔ بوٹے عجیب شان سے کھڑے تھے۔ پھول بہت ہی شوخ تھے۔ جیسے رنگین دیئے ٹمٹما رہے ہوں۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسان انوکھی رومان بھری فضا میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گاڑی یوں چلی جا رہی تھی جیسے مور چھاتی پھلا کر پرواز کر رہا ہو۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ مناظر کے حسن پر رو دے۔

امرتسر پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ کسی نئے شہر میں آ پہنچا ہو، جسے اس نے سپنے میں دیکھا ہو۔ سٹیشن کے گنبد الف لیلےٰ کے کسی پراسرار منظر کی یاد دلا رہے تھے۔ سڑکیں خوشی سے ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں لوگ آ رہے تھے۔ جیسے کسی تقریب پر اکٹھے ہو رہے ہوں۔

لیکن بورڈنگ میں وہی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ رامو بیٹھا برتن صاف کر رہا تھا۔ بندو آٹے کی بوریوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ ہرنام سنگھ، گورچرن سنگھ اور جیون ایک درخت کے نیچے بیٹھے اپنے کیس سکھا رہے تھے۔ کمرے میں اللہ داد کرسی پر اپنی قمیض

پھیلائے خود فرش پر بیٹھا سر پر آم کی خشک گٹھلی رگڑ رہا تھا۔

''ارے۔'' اللہ دادا سے دیکھ کر چلایا۔ ''تو آ گیا۔ بیٹا چار روز پہلے ہی ماں کی گود چھوڑ آیا تو۔ اونہوں یہاں تیرا جی نہ لگے گا۔''

''بک نہیں۔'' ایلی نے بناوٹی غصے سے کہا۔

''اچھا بھئی۔'' اللہ داد چلایا۔ ''ایک تم ہو کہ ماں کی گود نہیں چھوڑتے ایک وہ شفیع ہے۔ جو سارا سارا دن یوں سانپ مارنے میں لگا رہتا ہے۔ جیسے کالج میں سانپ مارنا سیکھنے کے لئے داخل ہوا ہو۔ بس ایک میں رہ گیا ہوں۔ محنت کرنے کے لئے۔'' یہ کہہ کر اس نے مظلومانہ انداز سے سر پر آم کی گٹھلی رگڑنی شروع کر دی جیسے امتحان پاس کرنے کے لئے سر پر آم کی گٹھلی رگڑنا لازم ہو۔

ایلی دھم سے چارپائی پر گر پڑا۔ اسے اللہ داد کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی نہ جانے کیا ہوا تھا اسے، دفعتاً اسے اس بورڈنگ، کالج اور شہر سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ کمرہ بیگانہ محسوس ہو رہا تھا اور اللہ داد یوں لگ رہا تھا جیسے اجنبی ہو۔

دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ گٹھلی رگڑتے رگڑتے اللہ داد نے ایک نظر ایلی کی طرف ڈالی اور پھر چپکے سے بولا۔ ''ارے بھائی پہلے تو ہم سمجھتے تھے کہ ایلی بابو ماں کی گود کے لئے بے تاب رہتا ہے۔ اس لئے بار بار گھر کو بھاگتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر آپ ہی آپ بولا۔ ''لیکن آخر وہ بھی تو گود ہے۔ دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔'' اللہ داد نے لمبی آہ بھری۔ ''وہ بھاگاں بھری تھی اپنی۔ اللہ جانتا ہے اس کی گود میں پڑ کر مجھے بے بے بھول جاتی تھی۔'' ایلی یہ سن کر بھونچکا رہ گیا اس کم بخت کو کیسے معلوم ہو گیا کہ..... اسے غصہ آنے لگا۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا اور اللہ داد کی معصوم مسکراہٹ کے جواب میں غصہ کرنا بالکل ہی بے معنی معلوم ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھ بیٹھا اور ٹہلتا ٹہلتا نہر کے کنارے پر جا پہنچا دراصل اس کا جی چاہتا تھا کہ اچانک نور سے ملاقات ہو جائے اور پھر شبھ لگن آ

جائے۔اس کے دل کے نچلے پردوں میں ایک شبھ لگن جھلک رہی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ دل کی گہرائیوں سے نکل کر وہ اس پر مسلط و محیط ہو جائے اور پھر وہ پودوں کی اوٹ میں بیٹھ کر چپکے چپکے رو دے۔آنسو اس کے گالوں پر ڈھلکیں اور نور پوچھے۔

''کیا ہے جی۔''جیسے اس کی عادت تھی اور وہ جواب دے۔''کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔''

''ہائیں۔''نہر کے کنارے آصف کو بیٹھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اس کی آنکھوں میں وہی پھوار پڑ رہی تھی لیکن یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ آیا وہ خوشی سے سرخ ہو رہی ہیں یا غم کی وجہ سے۔

''آ گئے تم.....''اس نے دبی دبی مسکراہٹ سے کہا۔

''ہاں۔''ایلی نے آہ بھری۔''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔نور کا انتظار کر رہے ہو کیا؟''

''اونہوں۔''آصف نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر۔''ایلی نے پوچھا۔''سیر کرنے آئے تھے۔''

''سیر.....''آصف نے زہر خند سے کہا۔''میں کہاں جاؤں ایلی۔''

''کیوں۔''ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔

''کوئی جگہ بھی تو نہیں رہی۔''

''کیوں۔''ایلی چلایا۔

دیس نکالا

''وہ.....وہ واپس آ گئی ہے۔''آصف نے آہ بھر کر کہا۔

''واپس آ گئی ہے۔''

''ہاں۔''وہ بولا۔''جیسے انتقام لینے آئی ہو۔''

''انتقام۔''ایلی نے دہرایا۔

''اب وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتی اور ایلی اب تو وہ اعلانیہ کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے گھر والے بیچارے ہار گئے ہیں۔ محلے میں کہرام مچا ہوا ہے اور میں گھر سے بھاگا پھرتا ہوں۔ اب ہوگا کیا ایلی۔ کیا کروں میں۔''

.....ایلی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس میں مشکل کون سی تھی۔ یہ تو بلکہ اس کی خوش نصیبی تھی۔ عجیب آدمی تھا آصف بھی۔

''دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی ہے۔

''دیکھتی ہے تو دیکھنے دو۔'' ایلی نے جواب دیا۔

''اتنی رسوائی اتنی بدنامی ہو رہی ہے کہ۔'' آصف نے جھرجھری لی۔ ''میرا تماشا بنا رکھا ہے اس کے گھر والے کہتے ہیں ہم کیا کریں۔ لڑکی ہوش و حواس کھو چکی ہے اور اگر اس پر.....'' وہ خاموش ہو گیا اور پھر حسرت و یاس بھری نگاہ سے اس نے ایلی کی طرف دیکھا۔

''میری طرف محلے والے یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی مجرم ہو۔ جیسے اس کی دیوانگی میری وجہ سے ہو۔ وہ تو پاگل ہو کر آزاد ہو گئی ایلی مجھ سے تو وہی اچھی ہے۔ لیکن میں کیا کروں میرا اپنے گھر میں آنا جانا بند ہو چکا ہے۔ مجھے تو دیس نکالا مل گیا ہے۔''

''اچھا۔'' ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

''اگر تم کہو تو میں تمہاری بورڈنگ میں آ رہوں۔'' آصف نے پوچھا۔

''ہاں۔ ہاں۔'' ایلی نے کہا۔ ''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔''

''تو میں کل آ جاؤں۔'' آصف کے منہ پر مسکراہٹ پھیل گئی جیسے وہ ایلی کا سہارا پا کر خوش ہو گیا ہو۔

''آ جاؤ۔'' ایلی خوشی سے چلایا۔ ''کتنا اچھا رہے گا۔ ہم صبح و شام اکٹھے رہیں گے۔'' ''سچ۔'' آصف نے اس کا ہاتھ دبایا اور نہ جانے کب تک وہ اسی طرح ہاتھ پکڑے نہر کے کنارے بیٹھے رہے۔ آصف اپنے خیالات میں مگن تھا مگر ایلی کے

روبرو کچھ اور ہی تھا ایک گورا گورا بازو اس کی طرف بڑھتا اور حنا مالیدہ ہاتھ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا۔ ''ایلی تم لوگوں کی پروا کرتے ہو؟'' دو گلابی آنکھیں اس کی طرف دیکھتیں، گلال بھری پچکاری چلتی اور اسے شرابور کر جاتی۔ وہ ایک نگاہ کس قدر مدہوش کن تھی۔ ایک نگاہ ..... اس نگاہ کو حاصل کرنے کے لئے ایلی دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ ساری دنیا کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ آصف سے وہ راز کہہ دے کسی سے کہہ دے اور اپنے آپ کو محفوظ کر لے مگر وہ شہزاد کا راز تھا وہ اسے کس طرح افشا کر سکتا تھا اور پھر آصف سے وہ راز کہنا جو اس غم میں گھل رہا تھا کہ ایک حسینہ اس کے لئے پاگل ہو رہی ہے۔ بھلا شہزاد کی مست کن نگاہ کو آصف کیسے سمجھ سکے گا۔ ایلی بات کہتے کہتے رک جاتا اور پھر آسمان پر پھیلی ہوئی سرخی کو دیکھنے میں کھو جاتا اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے شہزاد کے گالوں سے اتر کر وہ سرخی آسمان پر پھیل گئی ہو اور اس کا ہر چھوٹے سے چھوٹا دھبہ کہہ رہا ہو۔ ''تم لوگوں کی پروا کرتے ہو۔ تم ایلی۔'' اگلے روز صبح سویرے وہ دونوں پرنسپل کے گھر چلے گئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ آصف کو ایک ماہ کے لئے بورڈنگ میں رہنے کی اجازت دے دے۔

پرنسپل نے ان کی بات سن کر حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔

''آصف کیا بات ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''بات تو کوئی نہیں پرنسپل صاحب.....'' آصف کے چہرے پر گھبراہٹ کا طوفان آ گیا جو اس کی بات کو اعلانیہ جھٹلا رہا تھا۔ پرنسپل مسکرانے لگا۔

''بھئی ایک بات کرو۔ زبان سے کہہ رہے ہو کہ کچھ نہیں اور نگاہیں کہہ رہی ہیں بہت کچھ ہے۔'' ایلی نے گھبرا کر سچی بات کہہ دینے کی غرض سے منہ کھولا۔ ''جی بات یہ ہے۔'' وہ بولا۔ آصف نے بھرپور نگاہ ایلی پر ڈالی اس نگاہ میں ایک طوفان تھا۔ غصہ تھا۔ بے بسی تھی۔ منت تھی۔ دھمکی تھی۔ ایلی سہم کر خاموش ہو گیا۔

پرنسپل نے ان دونوں کی طرف تعجب سے دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''نہیں نہیں۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''پڑھائی کا بہانہ نہ کرنا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کا کیا فائدہ ہے تو بہتر ہے کہ صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ اس کی وجہ بتانے سے ہم قاصر ہیں۔ بہر صورت مجھے یقین ہے کہ تم شرارت کے درپے نہیں ہو اور کوئی ایسی بات سرزد نہ ہوگی جو کالج کے لئے باعث بدنامی ہو۔''

''جی نہیں ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔'' آصف بولا۔

''اچھا تو اجازت ہے۔'' پرنسپل نے کہا۔ ''اب تم جاؤ اور آرام کرو مجھے صورت حال اچھی نہیں دکھتی اگر تم مجھے دوست سمجھ کر بتا دیتے تو شاید میں مدد کر سکتا۔ لیکن خیر.....''

جب وہ بورڈنگ میں پہنچا تو لڑکوں نے اسے دیکھ کر شور مچا دیا۔ ''ایلی، ایلی۔ ارے تیرا تار آیا ہے۔''

دادی اماں

تار.....ایلی کا دل ڈوب گیا۔ تار آیا ہے۔ اسے زندگی بھر کبھی تار نہ آیا تھا۔ بس شہزاد کا راز کھل گیا۔ نہ جانے اب کیا ہوگا۔ شہزاد نے وہ بات بتا دی۔ اس روز کہتی جو تھی۔ ایلی مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی۔ تم نے یہ کیا کیا ایلی۔ ہائے تم نے یہ کیا کیا..... ایلی کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اب کیا ہوگا اور وہ برآمدے میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا۔

''ارے جا کر پتہ بھی لگائے گا کہ نہیں۔'' شفیع چلانے لگا۔

''اللہ داد بولا۔'' ''بھئی تار والا ادھر ہی تو گیا ہے تمہیں دیکھنے کے لئے۔''

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ چپکے سے بھاگ جائے۔ جہاں تار والا اسے تلاش نہ کر سکے تاکہ وہ اس خفت سے بچ جائے مگر اسے تار والے کی تلاش کرنا ہی پڑی۔ اللہ داد کیا کہے گا۔ لڑکے کیا سمجھیں گے اس کے باوجود وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ تار والا جا

چکا ہو۔

تار والے کو دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ اسے یوں بت بنے دیکھ کر اللہ داد نے تار اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور تار کھولتے ہوئے بولا۔ ''ماں اپنے لاڈلے کی فرقت میں اداس ہو گئی ہو گی۔'' دفعتاً اللہ داد خاموش ہو گیا۔ اس کی انگلیاں اضطراب سے تار کو پھر تہہ کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ ''ابے'' شفیع نے اس سے پوچھنے کے لئے کچھ کہنا چاہا مگر اللہ داد کا چہرہ دیکھ کر اس میں ہمت نہ پڑی دیر تک برآمدے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر آصف آہستہ سے بولا۔ ''ایلی تمہاری دادی اماں.....''

''دادی اماں۔'' ایلی نے حیرانی سے دہرایا۔

''ہاں۔ تمہاری دادی اماں چلی گئیں۔'' آصف نے کہا۔

''چلی گئیں؟.....'' ایلی نے گھبرا کر تار کی طرف دیکھا اس کے منہ سے ایک ہچکی سی نکلی اور پھر دور سے آواز آئی۔ ''نہیں ایلی۔ کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔''

جب وہ محلے کے چوگان میں پہنچا تو اس کا دل ڈوب گیا۔ چوگان کے عین درمیان میں جنازہ پڑا تھا۔ چاروں طرف محلے والے کھڑے تھے۔ محلے والیاں پنکھے چلاتے ہوئے کچر کچر باتیں کر رہی تھیں۔ محلے والے جنازے کے متعلق یوں تفصیلات طے کر رہے تھے۔ جیسے کوئی عام سی تقریب ہو۔ جس میں غم یا دکھ کا کوئی عنصر نہ ہو۔

ایلی کو دیکھ کر کوئی چلائی۔ ''اے ہے لڑکے کو تو آ لینے دو اپنی دادی کے قریب۔''

''ہائیں آ گیا تو ایلی۔ شکر ہے آ گیا تو۔''

''ہائے بہن اس کے بغیر تو دم نکلتا تھا اس کی دادی اماں کا۔''

''اس کے سوا اور تھا ہی کون اس کا۔ علی احمد نے تو کبھی پوچھا ہی نہیں۔''

''آخری دم تک یاد کرتی رہی تجھے۔ لے دیکھ لے اس کا منہ۔''

ایلی دادی اماں کی طرف دیکھنے سے ڈر رہا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ مری ہوئی دادی کی طرف دیکھے۔ نہیں نہیں وہ جیتی ہے مری نہیں۔ اس کے تخیل میں وہ ابھی تک جیتی تھی۔ وہ نہیں مر سکتی۔ وہ کبھی نہیں مر سکتی ایلی نے نگاہ پھیر لی اور دادی اماں کی طرف دیکھے بغیر ہی وہاں کھڑا رہا۔

جنازہ

چاروں طرف لوگوں کا جھمگٹا لگا ہوا تھا ہر کوئی دوسرے سے بات کر رہا تھا..... ان کی باتوں پر ایلی کو غصہ آ رہا تھا۔ کیا انہیں دادی اماں کی موت کا غم نہیں۔ کیا انہیں اس کی موت پر دکھ نہیں ہوا یوں شوخی سے ایک دوسرے سے باتیں کیوں کر رہے تھے۔ ناگاہ ایلی کی نگاہ علی احمد پر پڑی۔ وہ چپ چاپ بت بنے کھڑے تھے۔

ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا جیسے وہ دکھ محسوس کر رہے ہوں۔ پہلی مرتبہ ایلی کو خیال آیا کہ ان کے دل میں بھی جذبات ہیں۔ انہیں بھی کسی کے مرنے پر دکھ ہوتا ہے۔ انہیں بھی عزیزوں کے دکھ سکھ کا احساس ہے۔ یہ احساس ایلی کے لئے بالکل نیا تھا اور اتنا عجیب تھا کہ اس نے جلد ہی اس سے مخلصی پانے کی کوشش کی۔ پھر چار بزرگوں نے بڑھ کر جنازے کو اٹھا لیا اور وہ سب ان کے پیچھے پیچھے قبرستان کی طرف چل پڑے۔

علی پور کے بازار میں جنازے کو دیکھ کر راہ چلتے چلتے لوگ رک جاتے تھے۔ دوکاندار سودا سلف تولنا چھوڑ کر ایک طرف ادب سے کھڑے ہو جاتے گاہک بازار سے ہٹ کر کسی بند دوکان کے تختے پر چڑھ جاتے۔ کھیلتے ہوئے بچے سہم کر رک جاتے اور منہ میں انگلیاں ڈال کر حیرانی سے اس جلوس کی طرف دیکھتے۔

بازار سے نکل کر وہ کھیتوں میں جا پہنچے۔ کھیتوں پر کام کرنے والے کسان انہیں دیکھ کر کام چھوڑ کر ان کے ساتھ چل پڑے۔

''کیوں بھائی کس کا جنازہ ہے۔''

''مائی کس کی والدہ تھی۔''

''اچھا وہ جو دفتر کے بابو ہیں۔''

''آیا کرتے ہیں کبھی اس طرف۔''

''کیا تکلیف تھی۔''

''جی ہاں۔ وہ تو بہانے ہوتے ہیں۔ اصل میں تو تقدیر کا لکھا ہوتا ہے جو ہو کر رہتا ہے۔''

جنازے کے آگے محلے کے بوڑھے آخ تھو کرتے کھانستے چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی کھانسنے کے علاوہ مدھم آواز میں چلاتے ''یا رب العزت یا اللہ۔''..... ''قادر مطلق.....'' ان کے پیچھے پیچھے محلے کے جوان تھے اور سب سے آخر میں محلے کے نوجوان جو چلتے ہوئے ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے تھے، چٹکیاں بھرتے تھے، پھر یوں سنجیدگی اختیار کر لیتے تھے۔ جیسے وہ ایسی حرکت کے اہل ہی نہ ہوں۔ کبھی کبھار نوجوانوں کی قطاروں سے دبے دبے قہقہے بلند ہوتے جس پر محلے کے بوڑھے آخ کہہ کر رک جاتے اور تھوکرنے کی بجائے غضب آلود نگاہوں سے پیچھے کی طرف دیکھتے۔

لیکن اس روز ایلی سب سے پہلی قطار میں چل رہا تھا اسے احساس نہ تھا کہ بوڑھے مضحکہ خیز انداز میں آخ تھو آخ تھو کر رہے ہیں یا جوان دزدیدہ نظروں سے کھیتوں میں بنے ہوئے گھروندوں سے جھانکتی ہوئی سیاہ فام مگر نوجوان لڑکیوں کی طرف دیکھ رہے ہیں یا نوجوان کہنیاں مار مار کر ایک دوسرے کو کسی قابل توجہ منظر کی طرف دیکھنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ اس روز ایلی کا ذہن ایک وسیع خلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس پر ایک پریشان کن تعطل مسلط اور محیط تھا۔ نہ گھبراہٹ تھی نہ پریشانی نہ خوشی تھی نہ غم۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے..... دادی اماں کی موت کا

مفہوم کیا ہے۔اس کے نتائج کیا ہوں گے۔اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔وہ چلے جا رہا تھا خاموش بے حس!

وہ مر گئی

جنازے کی نماز کے بعد قبرستان میں دیر تک وہ اس جگہ بیٹھا رہا جہاں کھڑے ہو کر اس نے نماز پڑھی تھی اور جہاں پاس ہی چادر سے ڈھکی ہوئی چارپائی پر دادی اماں پڑی تھیں۔وہاں بیٹھے ہوئے اس نے اللہ سے بڑی عجز بھری دعائیں مانگی تھیں۔''یا اللہ یہ کیا ہو گیا یا اللہ دادی اماں اب مجھ سے کبھی نہ ملیں گی۔یا اللہ۔''اس نے بن سوچے سمجھے یہ سب دعائیں مانگی تھی۔اسے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ وہ دعائیں مانگ رہا ہے یا وہ دعائیں نہ تھیں بلکہ سوالات تھے۔عجیب سوالات تھے۔ایسے سوالات جن کا کوئی جواب نہ تھا۔دعائیں مانگ کر وہ وہیں بیٹھ کر زمین کریدتا رہا تھا۔حتیٰ کہ اسے اس مقام سے وحشت ہونے لگی۔دور لوگ قبر کھودنے میں مصروف تھے۔قبرستان میں یہاں وہاں محلے والے ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے دبی دبی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔جوان دور پختہ تالاب کی طرف نکل گئے تھے اور نوجوان نہ جانے کہاں تھے۔

وہ اٹھ بیٹھا اور پھرتا پھراتا ان کچی قبروں میں جا پہنچا جہاں محلے کے عام آدمی دفنائے جاتے تھے۔وہ گھبرا کر رک گیا۔سامنے صفدر ایک پیڑ کے نیچے چپ چاپ بیٹھا تھا۔نہ جانے وہ اپنی ہی دھن میں بیٹھا کیا سوچ رہا تھا۔اس وقت اس کی آنکھوں میں چمک نہ تھی۔بازو لٹک رہے تھے اور ہونٹوں پر کوئی بول نہ تھا۔

''تم ایلی۔''.....وہ اسے دیکھ کر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔''آؤ آؤ۔تالاب کی طرف چلیں۔آؤ۔ابھی قبر میں اتارنے میں دیر ہے۔آؤ۔''اس کی آواز روئی تھی۔

وہ دونوں چپ چاپ تالاب کی طرف چل پڑے۔''تم آ گئے.....''وہ بولا تم تو چلے گئے تھے نا اچھا کیا آ گئے۔''وہ بولا۔''بہت اچھا کیا۔میں بھی جا رہا تھا مگر

نہ گیا۔ محض اتفاق ہے ورنہ چلا جاتا۔'' اس کا گلا خشک ہو گیا۔

دیر تک صفدر خاموش رہا۔ پھر زیر لب بولا۔ ''مر گئی.....'' اور چپ ہو گیا جیسے گلا آواز سے خالی ہو۔ پھر دفعتاً اس کے ہونٹ ہلے اور اس نے مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا کر دور پھینک دیا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ کہہ رہا ہو حافظ خدا تمہارا جیسے دادی اماں پارسی لڑکی ہو اور اس کے چلے جانے پر صفدر کا گلا آواز سے خالی رہ گیا ہو۔

''تم کہتے تھے وہ مرتی بھی نہیں۔'' ایلی نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''ہاں۔'' صفدر بولا۔ ''کہتا تھا۔ مگر وہ مر گئی۔ مر گئی۔''

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے صفدر کا وہ ایک لفظ داستان کو چھپائے ہوئے ہو۔

''ہاں مر گئی۔''

صفدر کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ ایلی کی آنکھوں میں پھر سے آنسو آ گئے مگر صفدر اپنی ہی دھن میں گنگنائے چلا جا رہا تھا اور ہر دس قدم کے بعد چپکے سے کہتا ''مر گئی۔''

بھیانک اداسی

دادی اماں کو دفنانے سے فارغ ہو کر وہ محلے میں واپس پہنچے چوگان مین چاروں طرف کھڑکیوں اور منڈیروں پر عورتیں کھڑی تھیں اسے علم نہ تھا کہ شہزاد بھی وہیں کھڑی ہے۔ اس کے سیاہ دوپٹے میں ستارے چمک رہے ہیں بازو دوپٹے سے الجھے ہوئے ہیں۔ لمبی ترچھی آنکھوں پر مژگاں ڈھلکی ہوئی ہیں۔ اسے شہزاد کے وجود کا ہی احساس نہ تھا۔ وہ اسے بھول چکا تھا۔ اسے یاد ہی نہ تھا کہ شہزاد نے اس کے ہاتھ تھام کر اس سے کہا تھا۔

''ایلی تم لوگوں کی پروا کرتے ہو!.....تم ایلی؟''

چوگان سے وہ ان جانے مین گھر کی طرف چل پڑا۔ لیکن سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے۔ گھر میں اب

کیا دھرا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ تخت ویران پڑا ہوگا۔ چولہے کے پاس گھٹنوں میں سر دیئے کوئی بیٹھا نہ ہوگا۔ کوئی اس سے نہیں کہے گا۔

''تو آ گیا۔ میں نے تیرے لئے کچھ رکھا ہوا ہے۔ ہنڈیا میں۔''

کوئی نہیں چیخے گا۔ ''ہے تو نے تو میری ہڈیاں توڑ دیں۔''

کسی کا جھریوں بھرا ہاتھ اسے تھپکے گا نہیں۔ ''کچھ بھی تو نہیں ایلی۔'' وہ رک گیا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

''دادی اماں۔ دادی اماں۔'' وہ قبر پر بیٹھا رو رہا تھا۔ ''دادی اماں یہ کیا ہو گیا۔ کیا ہو گیا ہے یہ۔'' ایک بوڑھا چہرہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا دو جھلی دار بازو اس کی طرف بڑھے۔ ''کچھ نہیں ایلی۔ کچھ بھی تو نہیں۔'' چاروں طرف بھیانک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ قریب ہی کوئی کنواں کراہ رہا تھا۔ دور چکی ہونک رہی تھی۔ مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔

قبرستان سے اٹھ کر ابھی اس نے چند ایک قدم اٹھائے تھے کہ رضا آ گیا۔ ''تم'' ایلی نے رضا کی طرف تعجب سے دیکھا۔

''چل۔'' رضا بولا۔ ''تیرے ابا بلا رہے ہیں۔'' وہ خاموشی سے ایلی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایلی کا جی نہیں چاہتا تھا کہ گھر جائے لیکن وہ چپ چاپ رضا کے ساتھ چل پڑا۔

جب وہ گھر پہنچا تو علی احمد نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''بیٹھ جاؤ ایلی۔ تم کہاں آوارہ گھوم رہے ہو۔ فضول..... ایلی کی ماں۔'' انہوں نے ہاجرہ کو بلایا۔ ''اس کا بستر بچھا دو یہاں۔ آج یہ یہیں رہے گا۔ ہمارے پاس.....''

ایلی تم۔ تم ایلی

اگلے روز صبح سویرے ایلی چپکے سے علی پور سے امرتسر چلا آیا۔ نہ جانے اس کے لئے علی پور میں رہنا کیوں ناممکن ہو چکا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ علی پور سے چلا

جائے اس مکان سے دور بھاگ جائے اس کے لئے اس تخت کی طرف دیکھنا ناممکن ہو چکا تھا جہاں دادی اماں بیٹھ کر نماز پڑھا کرتی تھی۔

وہ رات علی پور میں اس نے یوں کاٹی جیسے کانٹوں پر پڑا ہو۔ اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ دادی اماں فوت ہو چکی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے تخت پر بیٹھی نماز پڑھ رہی ہو اور ابھی وہ نماز سے فارغ ہو کر چارپائی پر اس کے سرہانے آ بیٹھے گی اور اپنے جھلی دار ہاتھوں سے اسے تھپکنے لگے گی۔ ''سو جا ایلی سو جا۔ کچھ بھی تو نہیں۔''

اس خیال پر ایلی کو خوف سا محسوس ہوتا کہ دادی مر چکی ہے اور اب وہ کبھی آ کر اس تخت پر نماز نہیں پڑھے گی۔ اسی بے نام ڈر کی وجہ سے اب کی بار علی پور میں رہنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ علی الصبح وہ اٹھ بیٹھا۔ سیدہ کھڑکی کے پاس بیٹھی قرآن کریم پڑھ رہی تھی۔

''خالہ۔'' اس نے سیدہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''میں جا رہا ہوں۔''

''کہاں جا رہا ہے تو۔'' سیدہ نے سرسری طور پر پوچھا۔ ''جا رہا ہوں۔'' اس نے سر کی جنبش سے ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ''میں پوچھ رہی ہوں کہاں جائے گا تو اس وقت۔'' سیدہ چڑ گئی۔

''امرتسر'' وہ بولا جیسے امرتسر اس مکان کے کسی کمرے کا نام ہو۔

''امرتسر؟'' وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں۔'' ایلی نے کہا۔ ''مجھے جانا ہی چاہیے۔''

''ابا سے تو پوچھ لے۔'' وہ جھنجھلا کر بولی۔

''نہیں۔'' وہ بولا۔ ''پوچھنے کی کیا بات ہے اس میں۔''

''نہیں نہیں یہ مناسب نہیں۔'' وہ بولی۔ ''بڑوں سے بات کرنا اچھا ہوتا ہے۔''

ایلی نے گویا سیدہ کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔

سیدہ نے شور مچایا۔ ''ایلی امرتسر جا رہا ہے میں کہتی ہوں سنا آپ نے ایلی جا رہا

ہے۔'' اور سیدہ اسے آوازیں دیتی رہ گئی۔

علی احمد کی آواز سن کر وہ رک گیا اور اسے ان کے روبرو حاضر ہونا پڑا۔

''مجھے امتحان کے لئے تیاری کرنی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے جانا ہی چاہئے۔''

یہ بات سن کر علی احمد خاموش ہو گئے۔

''یہ تو بلکہ اچھا ہی ہے۔'' سیدہ بولی۔ ''پڑھائی میں لگ جائے گا۔''

گاڑی میں بیٹھتے ہی ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے دل کا بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ خلا جو اس پر مسلط اور محیط تھا اب ختم ہوا جا رہا تھا۔ لیکن اب غم بوند بوند اس کے بند بند میں سرائت کر رہا تھا۔

ایلی کی نفسیات کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ کسی تکلیف دہ واقعہ پر اس کے دل کو غم کا دھچکا نہیں لگتا تھا بلکہ ایسے واقعہ کی خبر سن کر اس کے ذہن میں ایک خلا پیدا ہو جاتا جو اس کے تخیل اور احساسات کو شل کر دیتا۔ دیر تک اس پر یہ کیفیت طاری رہتی۔ جیسے وہ عالم خواب میں گھوم پھر رہا ہو۔ پھر بوند بوند غم اس کے دل میں سرائت کرتا۔ اداسی چاروں طرف سے یورش کرتی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی ایلی نے محسوس کیا۔ جیسے ساری دنیا ایک بے معنی پھیلاؤ ہو چاروں طرف سے اداسی امڈی آ رہی تھی۔ دور درختوں کے جھنڈ میں دادی اماں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ ایلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ''اے ہے کیا ہے تمہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ کچھ بھی تو نہیں۔'' لیکن اس کے باوجود ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے کچھ ہو گیا ہو۔ کچھ کھو گیا ہو۔ ایلی نے آہ بھری۔ ''اب مجھے کون تھپک کر سلائے گا۔''

دفعتاً اس کی نگاہ تلے گھاس کی سبز گٹھڑی میں حرکت ہوئی۔ شہزاد کا متبسم چہرہ نمودار ہوا۔ پھولدار دوپٹے سے گورا چٹا بازو برآمد ہوا۔ ''میں جو ہوں۔'' وہ مسکرائی۔ ''میں جو ہوں۔ تم مجھے بھول گئے کیا۔''

شہزاد کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ ''ہائیں'' گھبرا کر اس نے شہزاد کی طرف دیکھا شہزاد تو بالکل اس کے ذہن سے مفقود ہو چکی تھی۔ اسے اس کے وجود کا احساس ہی نہ تھا۔ پورے چوبیس گھنٹے علی پور میں رہنے کے باوجود اس کے ذہن میں شہزاد کا خیال نہ آیا تھا اس نے محسوس کیا گویا وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا ہو۔ علی پور میں ایک دن رہنے کے باوجود اسے شہزاد کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ جیسے شہزاد اس کے لئے ایک دم معدوم ہو گئی ہو۔ شہزاد کے گھر کی دیواروں کی طرف دیکھنے کے باوجود اس کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہونے کے باوجود اس کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ اپنی اس دیوانگی پر وہ بوکھلا گیا۔ نہ جانے وہ دل میں کیا کہتی ہو گی وہ سمجھتی ہو گی کہ اس روز اس کے بازو پکڑ کر جو کچھ ایلی نے کہا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ فریب تھا محض وقتی دل بہلاوا تھا۔ اس پر اس کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ شہزاد دل میں کیا کہتی ہو گی۔ اف ایلی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

پھر اس کے دل میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ شاید شہزاد کو اس کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا ہو۔ شاید اس نے ایلی کو قابل توجہ ہی نہ سمجھا ہو۔ شاید اس کی وہ مسکراہٹ وہ جملہ۔ ''تم لوگوں کی پروا کرتے ہو؟ ایلی تم؟'' محض ایک مذاق ہو ایک ادا ہو۔ پھر اسے اس تمام واقعہ کی حقیقت پر شک پڑنے لگا۔ شاید یہ سب کچھ میرے دماغ کی اختراع ہو۔ ورنہ شہزاد میری پروا کرے؟ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شہزاد سی رنگین حسینہ مجھے دنیا کے روبرو کھڑے ہونے کی شہہ دے۔ نہیں نہیں یہ سب خوش فہمی ہے۔ محض خوش فہمی!

یہ سوچ کر ایلی گھبرا گیا۔ اس کی گرد و پیش سرسبز کھیت ویران ہونے لگے سرسوں کے پھول خزاں زدہ پتے دکھائی دینے لگے..... پھر دور ایک ٹیلے پر کھڑی ہو کر کوئی مسکرانے لگی۔ اس کے بازو ایلی کی طرف بڑھنے لگے۔ حنا مالیدہ ہاتھوں کی مٹھیاں کھلیں۔ ''ایلی تم؟'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''تم ایلی؟'' وہ آواز گاڑی کے پہیوں میں

گونجنے لگی۔ ایلی تم ہتم ہتم ایلی۔" گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ساری کائنات پھولدار آنچل میں لپٹی جا رہی تھی۔

اکتاہٹ

بورڈنگ کی سڑک پر نہر کے قریب اسے مہر اور نور ملے وہ دونوں بورڈنگ سے واپس آ رہے تھے۔

وہ دونوں ایلی کے قریب سے گزر گئے۔ چار ایک قدم چلنے کے بعد وہ رک گئے مہر کھڑا ہو گیا اور نور ایلی کی طرف بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی خم تھا۔ آنکھوں میں وہی نگاہ تھی۔ جسے دیکھ کر ایلی ندامت سے زمین میں گڑ گیا مہر کیا کہے گا۔ وہ ایلی کے متعلق کس قدر غلط اندازہ لگائے گا۔

"آ گئے۔" نور نے ترچھی نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔"

"کب آئے۔" نور کی نگاہوں نے ایلی کے چہرے پر پنجے گاڑ دیے۔

"ابھی۔"

"وہ مجھے ادھر آنے نہیں دیتے۔" اس نے شکایت کی۔

"کون؟"

"وہی۔" وہ مسکرایا۔ "محلے والے۔"

"کیوں؟"

"پتہ نہیں۔" نور نے ہونٹ بٹوہ سے بنائے۔

"اچھا۔" ایلی چل پڑا۔

"وہ شک کرتے ہیں۔" اس نے ایلی کا راستہ روک لیا۔

"ہوں۔" ایلی نے بے پروائی سے کہا۔

"پھر؟" نور نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو تم ان کے شکوک کو پورا

کیوں نہیں کرتے۔

''پھر کچھ نہیں۔'' ایلی نے جواب دیا اور بورڈنگ کی طرف چل پڑا جیسے وہ نور کی بات سمجھا ہی نہ ہو، چاروں طرف اکتاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

آموں کی کوٹھی کے میدان میں بہت سے لڑکے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ رسوئی سے پھلکوں کی بارش ہو رہی تھی۔

''آ گئے بابو جی۔'' راموا سے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے غلیظ دانت چمکے۔

کمرے میں آصف ہاتھوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ ''تم آ گئے۔'' وہ ایلی کو دیکھ کر بولا اللہ داد نے سر اٹھایا اور تہہ بند جھاڑ کر کہنے لگا۔ ''یہ تو جاتا آتا ہی رہتا ہے۔''

شفیع نے اللہ داد کو ڈانٹا۔ ''بک نہیں۔ دادی اماں کی موت کو تو کیا جانے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' اللہ داد نے زیر لب کہا۔ ''نہ اپنی کوئی دادی اور نہ اماں۔ وہ جو کٹڑے میں رہتی ہے نا خورشید بائی اس کے پاس گیا تھا۔ بہتیری منتیں کیں کہ مجھے بیٹا بنا لو لیکن سالی نے بات سنی ہی نہیں الٹا میرا شیوں سے کہہ کر مجھے باہر نکلوا دیا۔ لو بولو۔ اب میں کروں تو کیا کروں۔''

شفیع ہنسنے لگا۔ ''میں بتاؤں۔'' وہ بولا۔ ''بس چپ چاپ بیٹھا رہ تو۔''

اللہ داد آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد آصف اور ایلی چہل قدمی کے لئے باہر نکل گئے۔ فضا بے حد اداس تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں دھندلی سڑک ڈراؤنا منظر پیش کر رہی تھی۔ چپ چاپ وہ دونوں کمپنی باغ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً آصف گویا اس خاموشی سے اکتا کر بولا۔ ''ایلی۔''

''جی۔'' ایلی نے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے کہا۔

''میرا کیا ہوگا ایلی۔''

''کیوں؟''

''میرا انجام کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔'' وہ بولا۔

''خواہ مخواہ۔''

''خواہ مخواہ نہیں۔'' آصف نے کہا۔ ''میں محسوس کرتا ہوں۔''

''کیا محسوس کرتے ہو۔''

''جیسے جیسے نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔''

''آخر بات تو اتنی ہے نا کہ وہ آ گئی ہے۔''

''نہیں یہ نہیں۔'' آصف نے آہ بھری۔

''پھر؟''

''اس کی بات نہیں۔''

''تو پھر کس کی بات کر رہے ہو؟''

''میں کہتا ہوں۔ یہ لڑکیاں مجھے تنگ کیوں کرتی ہیں؟'' اس نے آہ بھر کر پوچھا۔

''تنگ تم خود ہوتے ہو آصف۔'' ایلی نے کہا۔ ''وہ نہیں کرتیں۔''

''تمہیں نہیں معلوم۔'' آصف نے جواب دیا۔ ''اب دیکھو نا کتنی بدنامی ہو رہی ہے میری نہ جانے اس نے وہاں گھر میں کیا طوفان بپا کر رکھا ہے۔ اماں کیا کہتی ہوں گی اور پھر محلے والے وہ تو پہلے ہی کہتے تھے۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔''

''تو انہیں کہنے دو تمہارا کیا جاتا ہے۔'' ایلی نے کہا۔

''نہیں نہیں۔'' آصف چلایا۔ ''تم ایسا نہ کہا کرو۔''

''تو بتاؤ کہ میرا کیا ہوگا؟'' آصف نے پھر آہ بھری۔

''مجھے کیا معلوم۔'' ایلی چڑ گیا۔

''نہ جانے کیا ہوگا؟'' آصف نے ہاتھ مل کر کہا۔ کچھ دیر کے لئے وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے پھر آصف نے بات بدلی۔

''ایلی۔'' وہ بولا۔ ''تم تیم سے نہیں ملے؟''

''تیم۔'' ایلی چونک پڑا۔ وہ تیم کو قطعی طور پر بھول چکا تھا۔

''مجھ سے چھپاتے ہو۔'' آصف ہنسا۔

''نہیں تو۔'' ایلی نے کہا۔ ایک ساعت کے لئے اس کے دل میں آئی کہ آصف سے شہزاد کی بات کہہ دے لیکن اس میں جرات نہ ہوئی۔ آصف سے بات کرنا ممکن نہ تھا ایلی محسوس کرتا تھا۔ جیسے طبعی رنگینی کے باوجود آصف ایک ملا تھا۔ جس سے دل کی بات نہ کہی جا سکتی تھی۔

اگلے روز کالج سے فارغ ہو کر ایلی آغا کی طرف چل پڑا۔ اسے اس کوچے سے بے حد دلچسپی تھی، ان چہروں سے تو اسے ڈر لگتا تھا جو کھڑکیوں اور جنگلوں میں بنے سنورے دکھائی دیتے تھے۔ لیکن کٹڑے والیوں کی لوچدار آوازیں سن کر ایلی کے دل پر سانپ لوٹ جاتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے کوئی کلیجہ مسل رہا ہو۔ اس میٹھی جلن میں کس قدر لذت تھی۔ پھر جب سارنگی کسی ایک چوبارے میں بین کرتی اور طبلہ سر پیٹتا تو ایلی پر کیفیت طاری ہو جاتی۔

ابھی وہ چوک میں ہی تھا کہ حیٰ نہ جانے کہاں سے آ دھمکا۔ ''ارے تم ایلی؟'' وہ چلایا۔ ''تم تو جیسے کھو گئے۔ کیا ہوا تمہیں۔''

''دادی اماں فوت ہو گئیں تھیں۔'' ایلی نے رونی آواز میں کہا۔

''اوہ۔'' ایک ساعت کے لئے حیٰ خاموش ہو گیا۔ پھر وہ مخصوص انداز سے مسکرانے لگا۔ ''دادی امائیں ایسا ہی کیا کرتی ہیں۔ ان کی تو عادت ہی ایسی ہے اب چھوڑو بھی۔ تم نے تو ایسا حال بنا رکھا ہے۔ جیسے دنیا تیاگ دو گے۔ آؤ تمہیں اپنی عاشق کے پاس لے چلوں۔ اسے دیکھ کر سب کچھ بھول جاؤ گے۔ شرط لگا لو۔ نہ بھولو۔ تو اپنا ذمہ۔ میں اپنے دکھ وہاں اٹھا کر لے جاتا ہوں اور وہ ایسی اچھی ہے کہ ایک نظر دیکھ لے تو سب بھول جاتا ہے آؤ۔'' ایلی کا جی چاہتا تھا کہ حیٰ اسے زبردستی

ساتھ لے جائے لیکن اس کے باوجود اس کے دل کے کسی کونے میں ڈر چھپا ہوا تھا۔

"نہیں نہیں۔" وہ جھجک کر پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں حئی اس کے احتجاج کو تسلیم نہ کر لے۔ اسے اکیلا چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ لیکن حئی اسے کھینچتا ہوا چوبارے پر چڑھنے لگا۔

بائی۔ اور "ہے نا۔"

پھر زینے میں حئی نے آواز دی۔ "ہے نا۔ ادھر آؤ بھاگ کر میں ایک شخص کو پکڑ لایا ہوں۔ بھاگ نہ جائے دوڑ کر آؤ نا۔" وہ چلاتا گیا۔

"ہے نا۔" کو دیکھ کر ایلی حیران رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رقاصہ کی طرح بنی سنوری ہوئی عورت ہوگی، اس کے کپڑوں میں وہی بھڑک ہوگی۔ اس کے بال ویسے ہی بنے ہوں گے۔ ان سے خوشبو کی لپٹیں آتی ہوں گی۔ لیکن وہ تو گویا باورچی خانے سے دال بھگارتی ہوئی اٹھ کر آئی تھے۔ کپڑے عام سے تھے۔ جن میں اجلا پن نام کو نہ تھا۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ آستینیں یوں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ جیسے روز کپڑے دھوتی ہو اور چہرے پر جوانی کی شگفتگی کے سوا سنگار کا کوئی عنصر نہ تھا۔ وہ بھاگی بھاگی آئی اور سوچے سمجھے بغیر ایلی کا بازو پکڑ کر اسے کھینچنے لگی۔ ایلی نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ وہ یوں مسکرا رہی تھی جیسے صدیوں سے اسے جانتی ہو اور اس کا جسم یوں بے تکلفی سے ایلی سے چھو رہا تھا۔ جیسے وہ عورت ہی نہ ہو۔

پھر چند ہی منٹوں میں وہ ایلی کے پاس ایک ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی بلا تکلف باتیں کر رہی تھی۔ "حئی نے مجھے کئی بار تمہارے متعلق بتایا ہے۔ حئی کہتا کہ تم اس کے دوست ہو۔ مجھے حئی کے سبھی دوست پیارے ہیں۔" وہ مسکرائی اور پھر ہم۔ ہم نام بھی تو ہیں۔ تم الیاس ہو اور میں الماس کچھ زیادہ فرق تو نہیں۔ ہے نا تو حئی مجھے پیار سے کہتا ہے میرا اصلی نام تو الماس ہے۔"

"بکتی ہے یہ۔" حئی چلایا۔ "الماس ولماس کوئی نہیں یہ۔ وہ تو نمائشی چیز ہوتی

ہے۔ یہ ہے نا۔ تو خالص گھر کی رانی ہے۔ کیوں ایلی؟"

"ہاں۔" ایلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیوں ایلی۔" حیٰ نے پوچھا۔ "ہے نا الماس بائی ہو سکتی ہے کیا؟"

"ہے نا۔" کی آنکھیں پرنم ہو گئیں ..... وہ مسکرائی۔ "گھر کی رانی کو سبھی کچھ میسر ہے ایک گھر نہیں۔ اور نہ ہو گا۔" اس کے گالوں پر آنسو ڈھلکنے لگے۔

"پاگل پاگل۔" حیٰ غصے سے چیخنے لگا۔ "پھر وہی حماقت۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ہے نا نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔ "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ گھر نصیب نہ ہو گا تم چاہے لاکھ کہو۔"

"میں کہتا ہی کیا ہوں۔" حیٰ ہنسا۔

"چاہے کہو بھی۔ لیکن جو لکھا ہے ہو کر رہتا ہے یہ چند دن تو میں گھر بنا کر رہ لوں گی پھر چاہے کچھ ہو جائے۔ یہ چند روز۔" اس کی آواز بھر آئی۔ "ایلی تم بھی یہاں میرے پاس رہو۔ رہو گے؟ چند روز تو ہیں۔ صرف چند روز پھر ایک دن الماس بائی کو چوبارہ میں جانا ہی پڑے گا۔" ہے نا نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ وہیں جا بیٹھے گی جہاں سے آئی ہے۔" ہے نا نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

ایلی بت بنا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"پاگل۔" حیٰ چلایا۔

"کیوں ایلی رہو گے میرے ساتھ؟ جب حیٰ چلا جاتا ہے تو یہ گھر ویران ہو جاتا ہے، پھر میں اکیلی بیٹھی گھبرا جاتی ہوں۔ تم آ جاؤ تو ہم اکٹھے رہا کریں گے تمہیں بہت سے باتیں سنایا کروں گی میں ..... بہت سی آؤ گے نا؟"

"میں میں۔" ایلی گھبرا گیا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ ہمیشہ کے لئے ہے نا کے پاس آ رہے ہر وقت چارپائی پر اس کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا رہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کی باتیں سن کر ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اس سے قریب تر ہو جائے

اور قریب اور قریب اور پھر اپنا سر اس کے زانو پر رکھ کر سو جائے۔ اسے اپنی اس خواہش پر ندامت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ خواہش اس کے دل سے نکلتی نہ تھی۔

دفعتاً کمرے میں شور سنائی دیا۔ حیٔ تڑپ کر اٹھا۔ ''کیا ہے کیا ہے؟'' وہ چلایا۔

''ہونا کیا ہے۔'' ہے نا بولی۔ ''وہی جو اس بازار میں ہوتا رہتا ہے اور کیا۔''

''کیا ہوتا رہتا ہے یہاں۔'' ایلی نے پوچھا۔

''دیکھ لو چل کر۔'' وہ بولی۔ ''چلو۔''

''یہاں تو بھیڑ لگی ہے۔'' ایلی نے بازار میں جھانک کر کہا۔

''وہ تو لگی ہی رہتی ہے۔ یہ بازار بوتل کی طرح چڑھ جاتا ہے۔'' وہ بولی۔

''ہے نا ہے۔'' حیٔ دوسری کھڑکی میں سے چلایا۔ ''سنا تم نے رؤف گرفتار ہو گیا۔'' ''ہائیں'' ہے نا نے سینہ تھام لیا۔ ''وہ سیٹی پیٹی والا راجا گرفتار ہو گیا کیا۔''

''ہاں'' حیٔ سیڑھیوں کی طرف بھاگتے ہوئے بولا۔ ''وہی۔ میں ابھی آیا۔'' اور پھر زینہ اترنے لگا۔

''ہے نا کھڑکی میں ایلی پر جھک گئی حتیٰ کہ اس کا تمام تر جسم ایلی سے چھونے لگا ایلی نے حیرانی سے ہے نا کی طرف دیکھا مگر وہ اپنی ہی دھن میں نیچے دیکھ رہی تھی اسے احساس ہی نہ تھا کہ اس کا جسم ایلی سے مس ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے پر وہی پاکیزگی وہی گھر کی دیوی پن واضح تھا لیکن ایلی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ اس جھکی ہوئی عورت کا دودھ پیتا بچہ ہو جسے اس نے چھاتی سے لپٹا رکھا ہو۔

دفعتاً ہے نا نے محسوس کیا کہ ایلی سمٹا جا رہا ہے۔

''ہیں یہ تم سمٹے کیوں جا رہے ہو۔'' اس نے پوچھا۔

''تم بہت قریب ہو نا اس لئے۔'' ایلی نے ڈرتے ڈرتے اسے چھیڑا۔

''تو پھر کیا ہوا۔'' وہ ہنسی اور اس نے ایلی کو دونوں ہاتھوں سے آغوش میں لے کر بھینچ لیا۔ ''تم تو ہمارے اپنے ہو۔'' وہ یوں بولی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو آغوش میں لے کر اس کا منہ چوم لیتی ہے۔

یہ محسوس کر کے ایلی احساس ندامت میں ڈوب گیا اور ہے نا پھر سے اس کے وجود سے بے خبر ہوگئی۔

''یہ سیٹی والی چپٹی والا کلموہنہ میرے پاس بھی آیا تھا۔ سمجھتا تھا کہ ڈر جائے گی۔ مگر میں کیا سمجھتی ہوں ایسوں کو۔ وہ ڈانٹا میں نے کہ پھر کبھی میرے گھر کا رخ نہیں کیا۔''

''لیکن اسے قید کیوں کر لیا گیا ہے؟'' ایلی نے پوچھا۔

''کچھ کر دیا ہوگا نشے میں۔'' وہ بولی۔ ''کسی کو قتل نہ کر دیا ہو۔''

اسی وقت ایک ساعت کے لئے ''ہے نا'' کی جگہ بائی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اس نے دونوں ہاتھ اپنے کولہوں پر رکھ لئے۔ ہونٹ بٹوہ سے بن گئے اور آنکھ میں چمک لہرائی۔

''سمجھتا تھا'' وہ بولی۔ ''کہ اسے بھی دھمکی دے کر گرا لوں گا.......... بڑا بنتا تھا۔''

ایلی الماس کو دیکھ کر گھبرا گیا.......... ''ہے نا'' وہ بولا ''پانی پلاؤ گی۔''

''پانی'' وہ چونک پڑی اور دفعتاً بائی کی جگہ ہے نا مسکرانے لگی۔ ''تم بھی مجھے تنگ کرنے لگے ہو۔'' وہ چلائی اور اندر جا داخل ہوئی۔

''ایلی یہاں آؤ۔ یہاں نیچے بازار میں۔'' حیٔ چلانے لگا۔ اس کی آواز سن کر ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ الماس کے چوبارے میں تھا۔ اسے شرم آنے لگی۔ گھبرا کر کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا اور پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ حیٔ کو خاموش کرنے کے لئے اسے نیچے جانا ہی پڑے گا۔ جب وہ سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو ہے نا بھاگی

بھاگی آ گئی۔

''یہ لو اپنا پانی۔'' وہ بولی اور اپنے آپ کو یوں سنبھالنے لگی۔ جیسے گاؤں کی الہڑ گوریاں بھاگنے کے بعد تھک کر آنچل اور اپنا آپ سنبھالتی ہیں۔

''میں جا رہا ہوں۔'' ایلی نے کہا اور زینہ اترنے لگا۔

''پھر آؤ گے نا۔'' وہ بولی۔ ''ضرور آنا۔ میں یہاں اکیلی بیٹھے بیٹھے تھک جاتی ہوں۔ ضرور آنا۔ ضرور۔'' اس کی آواز گونج رہی تھی اور ایلی بازار میں پہنچ چکا تھا۔

انوکھی تحقیق

کٹڑے میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ لوگ جگہ جگہ گروہوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ پنواڑیوں کی دوکانوں پر لوگ جمع تھے۔ پان کی پیک تھوک کر یا سگریٹ کا لمبا کش لگا کر وہ بار بار سبز جنگلے والے چوبارے کی طرف دیکھتے اور پھر چہ میگوئیاں کرنے لگتے۔

چوباروں میں رقاصائیں منہ میں انگلیاں ڈالے کھڑی تھیں اس وقت انہیں بناؤ سنگھار کا ہوش نہ تھا۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ان کے بال پریشان ہو رہے ہیں۔ چہروں پر تھکن کی جھریاں پڑی ہیں۔ گال پاؤڈر اور روغن سے خالی ہیں یا پاؤں ننگے ہیں۔ غالباً اس وقت انہیں یہ احساس نہ تھا کہ وہ رقاصائیں ہیں۔ اس وقت تمام بائیاں ہے نا بنی ہوئی تھیں۔ جیسے دفعتاً باورچی خانے سے کام کرتے کرتے بھاگ کر جنگلے میں آ کھڑی ہوں۔

وہ سب حیرانی سے سبز جنگلوں کے مکان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سبز جنگلہ ویران پڑا تھا۔ بازار میں لوگ حیرانی سے چلا رہے تھے۔

''بھئی حد ہو گئی۔ وہی سیٹی پیٹی والا راجہ..... حد ہو گئی۔'' ایک بولا۔

''سالہ مخومت کرتا تھا یاں کٹڑے پر۔''

''حکومت سی حکومت سنا ہے سیٹھ جمنا داس نے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کے

روبرو۔"

"بھئی کیوں نہ جوڑتا۔ دل کا معاملہ تھا۔"

"سیٹی پیٹی والا چاہتا تو سالہ چار موٹر کاریں مانگ لیتا۔ سیٹھ سے۔"

"موٹر کیا ہے جو چاہتا سو لیتا ہاں۔"

"پر اسے تو میاں 'شادی' کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ وہ اس کے سر پر سوار تھی۔"

"وہ شادی سالی ہے بھی تو بند بوتل چڑھ جاتی ہے ایک دم۔"

"پر اب تو بابو کھل گئی وہ بند بوتل۔ کیوں بھئی۔"

"پر مالم کیسے ہوا پہلوان کو کہ سالہ ویسے ہی راجہ بنا ہوا ہے جھوٹ موٹ کا۔"

"بس ہو گیا۔ کاٹھ کی ہنڈیا کب تک چڑھتی ہے۔ ہاں۔"

"بھئی ہنڈیا تو آٹھ مہینے چڑھی رہی۔ میرے بھائی۔"

"اور میں کہتا ہوں یہ تو چڑھی ہی رہتی اگر اپنے بابو کی بنی کو نہ چھیڑتا وہ۔"

"کون بنی؟"

"ارے یہی سبز جنگلے والی۔"

"وہ جو سانوری سلونی سی ہے؟"

"ہاں ہاں بڑی مرچیلی ہے وہ۔ بابو اس کے ہاں آتا جاتا ہے نا۔"

"کون بابو؟"

"بابو کو نہیں جانتے۔ بھئی وہ گورا چٹا۔ یہیں کٹڑے میں رہتا ہے۔ سرداراں کے چوبارے کے پچھواڑے کی گلی میں کھفیہ پولیس میں ہے وہ بابو اپنا۔"

"لیکن کیسے معلوم ہوا کہ سیٹی پیٹی والا بناوٹی افسر بن کر تحقیق کر رہا ہے۔"

"بس جی بابو نے پہلے تو اس بہروپیے کی منتیں کیں۔ تم جانتے ہو کہ ایک محکمے کے آدمی ایک دوسرے سے بات کر لیتے ہیں اپنے بابو نے کہا بھئی جس پر جی چاہے ہاتھ رکھڈالو اپنے کو کچھ تعلق نہیں پر "بنی" پر ہاتھ نہ ڈالنا۔"

''پھر کیا ہوا؟''

''بات تو کھری کہی بابو نے پیارے۔''

''ہاں بھئی صاف بات اچھی ہوتی ہے۔''

''پر وہ تو گویا نفلوں کا بھوکا تھا۔ اسی شام کو وہ ''بنی'' کے چوبارے پر چڑھ گیا اور بابو خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پھر بابو نے جا کر دفتر سے مالومات لیں۔ اس سے پوچھا اس سے پوچھا پوری تخیخ کی اور مالوم ہوا کہ سرکار نے تفتیش کے لئے کوئی حکم جاری نہیں کیا اور بس صاحب آج بابو میاں دوکان پر آیا اور بولا استاد آج کہیں سرکنا نہیں وہ تماشہ دکھاؤں گا کیا یاد کرو گے ایسا تماشہ کٹڑے والوں نے کبھی نہ دیکھا ہوگا اور اس وقت وہ اوپر ''بنی'' کے چوبارے میں ہے اور ساتھ پلس ہے تاکہ سیٹی پیٹی والے کو ہتھکڑی لگا لے۔''

''ہوں تو یہ بات ہے۔''

''بھئی شاباشے بابو کا۔''

''بڑا مجھے کا آدمی ہے وہ اگرچہ ہے کھفیہ پلس کا پر اپنا یار ہے۔''

عین اس وقت آغا آ گیا۔ اس کے چہرے پر وہی بے نیازی برس رہی تھی۔

''تم ہوا یلی؟'' آغا اس کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ سرسری انداز سے بولا۔ ''آ گئے تم۔ اب کی مرتبہ تو دیر کر دی تم نے یہ تماشہ دیکھا حد ہو گئی۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ انکوائری محض ڈھونگ ہے اور وہ سی آئی ڈی کا انسپکٹر دراصل ایک موقوف شدہ پلیسہ ہے۔ پٹھے نے آٹھ مہینے کٹڑے میں عیش کئے ہیں۔ دعوتیں اڑائی ہیں۔ مجرے دیکھے ہیں۔ گانے سنے ہیں اور جس کی بیچ پر چاہا لیٹا ہے۔ خدا کی قسم ایسا ستم ظریف تھا کہ چوٹی کی بائیوں سے چلمیں بھرواتا رہا۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''لیکن۔'' ایلی نے پوچھا۔ ''پوری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''ہاں۔'' آغا ہنسا۔ ''میں سمجھا شاید تم جانتے ہو اس معاملے کو کٹڑے کا تو بچہ بچہ جانتا ہے۔'' آغا ہنسنے لگے۔

''کیا واقعی۔'' ایلی نے کہا۔

''یہ سیٹی پیٹی والا انسپکٹر پہلے پولیس میں تھا۔ پھر نہ جانے کس وجہ سے برخواست ہو گیا۔ اس کے بعد اس شخص نے ایک جعلی حکمنامہ بنایا۔ جس میں لکھا تھا کہ فلاں شخص نے حکومت کا ایک لاکھ روپیہ غبن کیا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے زیادہ تر روپیہ امرتسر کٹڑہ رنگین میں اپنی محبوبہ بنام سردار و یا بہار و پر صرف کیا ہے۔ انسپکٹر رؤف کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ موقعہ پر جا کر اس امر کی تحقیق کرے اور اپنی رپورٹ پیش کرے۔'' آغا صاحب ہنسنے لگے۔

''کمبخت کو کیا بات سوجھی اور پھر اس نے رقاصاؤں کے جو دو نام لکھے اس خط میں وہ بہت سوچ کر لکھے۔ چونکہ کٹڑے میں ان ناموں والی بہت سی رقاصائیں ہیں اور وہ سب اوپر کے درجے کی ہیں۔ بس تو اس نے وہ خط یہاں کے ایس پی کو دکھایا۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس کے بعد اس نے تفتیش کے پردے میں وہ کیا جس کا جواب نہیں۔''

''آخاہ آغا ہیں۔'' ایک نووارد ان کی طرف بڑھا اور وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے سبز جنگلے والے چوبارے کی طرف چل دیئے۔

ایلی نے آغا کی ڈیوڑھی کی طرف دیکھا وہاں نیم کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نیم کو اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھ کر ایلی کا دل ڈوب گیا۔ معاً اسے خیال آیا شاید تیم بھی وہیں کہیں موجود ہو گی۔ وہ تڑپ کر مڑا مگر آغا کے چوبارے کی کھڑکیاں جوں کی توں بند تھیں۔ چقیں بے جان انداز سے لٹک رہی تھیں اور حرکت سے قطعی طور پر بے گانہ تھیں۔ اوپر کوٹھے کی منڈیر پر سر یا بازو کا کوئی حصہ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ ایک بار پھر اس پر مایوسی چھا گئی۔ اس نے نیم کی طرف دیکھا جو ویسے ہی کھڑی

مسکرا رہی تھی۔اس کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی خوشخبری اس کے ہونٹوں میں دبی ہوئی ہو۔

باادب باملاحظہ ہوشیار

ایلی نے آغا کی طرف دیکھا وہ دور جا چکا تھا۔حمی پان کی دکان پر کھڑا باتوں میں مصروف تھا۔اس نے دو ایک مرتبہ ادھر ادھر دیکھا اور پھر حالات کو سازگار سمجھ کر نیم کی طرف بڑھا۔اسے آتے دیکھ کر نیم کے ماتھے پر پیارا شکن پڑ گیا۔بھویں کمانوں کی طرح ہوتی گئیں۔

''ہم نہیں بولتے تم سے۔'' وہ ایک انداز سے زیر لب بولی۔

''کیوں؟'' ایلی نے نگاہیں چمکاتے ہوئے کہا۔

''بس تم نے کھو دیا۔'' اس نے ناک چڑھا کر کہا۔

''کیا کھو دیا؟'' ایلی نے پوچھا۔

''سب کچھ۔'' وہ بولی۔''تم تو بس کھو ہی دیتے ہو۔میں بناتی ہو بات اور تم بگاڑ دیتے ہو۔

''آخر بتاؤ بھی نا۔'' ایلی نے پوچھا۔

''پھر تم آتے کیوں نہیں ہمارے یہاں۔'' وہ بولی۔

''تمہاری آپا جو چھپی رہتی ہے۔'' اس نے پینترہ بدلا۔''دیکھ لو آج بھی چھپی بیٹھی ہے۔''

''اوں۔'' وہ بولی۔''وہ تو نہیں چھپتی پر دادی اسے باہر آنے بھی دے۔''

''کیوں دادی کیا پکڑے رکھتی ہے اسے۔''

''سائے کی طرح سوار رہتی ہے۔آپا کہتی تھی.....'' وہ رک گئی۔

''میرے متعلق کچھ کہتی تھی۔بتاؤ۔'' ایلی نے منت کی۔

''نہیں بتاتی۔'' اس نے بسور کر کہا۔''مجھ سے ملتے جو نہیں تو بتاؤں کیوں۔''

''تم بڑی پیاری ہو۔'' وہ اس کے قریب تر ہو گیا۔

''جھوٹ۔'' نیم نے اپنا آپ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''چھوڑو ہمیں۔''

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ چھوٹی سی لڑکی درحقیقت ایک بالغ عورت ہو۔ ایک عورت جو لبھانے کے انداز سے پورے طور پر واقف ہو۔ اس نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ نیم نے اس حوالگی کے باوجود اپنا منہ موڑ رکھا تھا۔

عین اس وقت ایک شور اٹھا اور کٹڑے میں کھڑے تمام لوگ سبز جنگلے والے مکان کی طرف بھاگے۔ ''ادھر آؤ۔ ادھر آؤ۔'' حیٔ نے بڑھ کر ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''وہ اسے نیچے لا رہے ہیں۔'' حیٔ ایلی کو دیوانہ وار گھسیٹنے لگا۔

وہاں ایک کہرام مچ گیا۔

''جوتے مارو جوتے۔''

''کہاں ہے بہروپیہ؟''

''پکڑ لیا گیا۔''

''اسے لا رہے ہیں۔''

''پہلوان ذرا دیکھنا دوکان کو میں آیا۔''

سب لوگ دیوانہ وار سبز جنگلے والے چوبارے کی طرف لپکے۔ حیٔ نے دو ایک کو گرایا دو ایک کو پچھاڑا اور وہ دھاڑتا ہوا ایلی سمیت سبز جنگلے والے چوبارے کی سیڑھیوں کے سامنے جا پہنچا۔ چند ایک سپاہی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ ہجوم کو دیکھ کر انہوں نے اپنے چابک چلانے شروع کر دیئے۔ ''ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔'' لوگوں نے بڑی مشکل سے راستہ دیا۔ حیٔ یہ دیکھ کر اس دوکان کی طرف لپکا جو ان سیڑھیوں سے ملحقہ تھی اور اس نے ایلی کو چھجے پر گھسیٹ لیا۔

سپاہیوں کے پیچھے سیٹی پٹی والا رؤف ہتھکڑی پہنے بڑے وقار سے آ رہا تھا۔

ایک ساعت کے لئے وہ رکا۔ اس نے بڑے غیور انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر بارعب انداز سے بولا۔ جیسے اپنی رجمنٹ کو حکم دے رہا ہو۔

''اے ہمارے لئے موٹر بھی نہیں لائے تم۔ ہم موٹر کے بغیر کیسے جائیں گے۔''

بابو نے ایک زہر خند مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔ سپاہی مسکرائے۔

''اور دیکھو۔'' ملزم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں سگریٹ چاہئیں پہلوان۔''

وہ چلایا۔ ''سگریٹ کا ایک ٹین۔''

''سگرٹ کا نہیں۔'' پہلوان پنواڑی چلایا۔ ''اب تو بیٹے ویسے ہی ٹین پاٹ ہو گا۔''

''سالا موٹر مانگتا ہے۔'' ہجوم سے آواز آئی چل تو سہی تھانے میں تیرا ایکسیلیٹر دبائیں گے تو ہوش آ جائے گا۔''

''ارے او سیٹی والی بیٹی۔''

''خاموش۔'' ملزم نے انہیں ڈانٹا۔ ''ہمیں نہیں جانتے تم۔''

بابو ہنسنے لگا۔ ''اب سالا دیوانہ بنتا ہے۔''

''بکا رخویش ہشیار ہے۔''

وہ جلوس آہستہ آہستہ کٹڑے میں چلنے لگا۔ ہجوم نعرے لگا رہا تھا۔ لوگ بیڑیوں کے ٹکڑے اس معزول شدہ راجہ پر پھینک رہے تھے۔ اوپر رقاصائیں جنگلوں نے نیچے لٹکی ہوئی تھیں کئی ایک ہاتھ مل رہی تھیں۔ کئی ایک شرمندگی محسوس کر رہی تھیں کہ انہیں دھوکہ دے کر لوٹ لیا گیا اور وہ سیٹی بیٹی کا متوالا تحکمانہ انداز سے احکامات جاری کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

''ہٹ جاؤ یہ ہمارا جلوس ہے با ادب باملاحظہ ہوشیار۔''

اس روز شام کو جب ایلی واپس اپنے بورڈنگ ہاؤس کو جا رہا تھا تو وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود سیٹی بیٹی کا بہروپیہ ہو اور ایک روز اسے بھی یونہی جلوس میں چلتے ہوئے

پکارنا ہوگا ''با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔''

الوداع

پھر وہ سب امتحانات کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ شفیع صبح سویرے ہی اپنی ہاکی سٹک اور کتابیں اٹھا کر قریب کے باغ میں جا بیٹھتا اور وہاں دن بھر پڑھنے اور سانپ مارنے کے مشاغل میں وقت کاٹتا۔ آصف اور ایلی نہر کے کنارے جا بیٹھتے۔ جہاں آصف پڑھنے کے علاوہ ٹھنڈی آہیں بھرتا اور بار بار ایلی سے پوچھتا ''ایلی اب کیا ہوگا'' اور ایلی یہ سن کر سونے لگتا اس وقت اس کے روبرو شہزاد آ کھڑی ہوتی اس کے حنا مالیدہ ہاتھ ایلی کی طرف بڑھتے اور پھر ایک رنگین آواز سنائی دیتی۔ ''ایلی تم، مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی۔''

''ایلی اب کیا ہوگا۔'' آصف کی آواز سنائی دیتی اور پھر ایلی کے سامنے وہ سیٹی بیٹی کا دیوانہ آ موجود ہوتا اور تحکمانہ انداز سے چلاتا ''با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔''

اللہ داد سارا دن کمرے میں بیٹھا رہتا اور پڑھنے کے علاوہ سر پر آم کی گٹھلی رگڑتا رہتا اور پھر با آواز بلند بنگالی بابو کو گالیاں دیتا جس کی وجہ سے وہ گوشت کھانے سے محروم کر دیا گیا تھا۔

''ان ہندوؤں کو اللہ غارت کرے یا مہاتما بدھ ان پر اپنا قہر نازل فرما کہ انہوں نے ایک سچے مومن پر گوشت کھانا حرام کر رکھا ہے۔''

''رام ان کو بن باس دے کہ انہوں نے مجھے دال کھلا کھلا کر تباہ کر دیا ہے میرا معدہ ہر وقت لاحول پڑھتا ہے۔''

اللہ داد کا شور سن کر ہرنام اور لینا سیاں آ جاتے اور وہ سب مل کر شور مچاتے۔ ہوسٹل کا بنگالی سپرنٹنڈنٹ اللہ داد کی بد دعائیں سنتا اور چوری چوری مسکراتا کیونکہ وہ خود مظلوم تھا۔ سبھا والوں نے اس پر بھی مچھلی کھانے کے خلاف پابندی لگا رکھی تھی۔

جب وہ سب امتحان سے فارغ ہوئے تو اللہ داد نے سکھوں کے ساتھ مل کر

بورڈنگ میں ایک جلوس نکالا۔ وہ جلوس تین لڑکوں پر مشتمل تھا ایک ہندو ایک مسلمان اور ایک سکھ، اللہ داد خود اس جلوس کا لیڈر تھا۔ وہ ہر کمرے میں جا کر نعرہ لگاتے۔

''جے ہندو دھرم کی جے۔''

''اے ہندوؤ۔'' اللہ داد چلاتا ''خدا تمہارا کلیان کرے۔ تم نے سال بھر ہمیں دالیں کھلا کھلا کر اندر باہر سے خوشبو دار بنا دیا ہے۔'' اس پر باقی لڑکے چلاتے۔

''جے ہندو دھرم کی جے۔''

اللہ داد کے نعرے سن کر رسوئی کے تمام نوکر مسرت سے سر ہلا رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ واقعی اندر باہر سے خوشبو دار ہونا ایک قابل تعریف امر ہے۔ ہندو جذبات کے اثر سے بھیگی ہوئی تحسین بھری نگاہوں سے اللہ داد کو دیکھ رہا تھا۔ دور بنگالی بابو زیر لب مسکراتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ ادھر آصف اپنی ہی دھن میں کھویا ہوا ایلی کے کان میں کہہ رہا تھا ''اب کیا ہوگا اب میں گھر کیسے جاؤں گا ایلی؟''

عین اس وقت پرنسپل اپنی لینڈو میں آموں والی کوٹھی میں آ دھمکا۔ چند ایک ساعت کے لئے پودوں کے پیچھے چھپ کر وہ لڑکوں کی باتیں سنتا رہا پھر معاملہ کی نوعیت کو بھانپ کر مسکرایا اور وہیں سے چلانے لگا۔ ''او اللہ داد یہ کیسا شور ہے؟''

جلوس پرنسپل کو دیکھ کر تھم گیا۔ سکھ دفعتاً اپنے کھلے بالوں میں کنگھی کرنے میں مشغول ہو گئے۔ رامو اور لالو بھاگ کر رسوئی میں برتن صاف کرنے لگے۔ اللہ داد ایک ساعت کے لئے چپ چاپ کھڑا رہا اور پھر اسے سوجھی۔ اس نے جیب سے آم کی خشک گٹھلی نکالی اور اسے اپنے سر پر رگڑنے لگا۔

''کیا کر رہے ہو اللہ داد۔'' پرنسپل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''سلام پرنسپل جی۔ سر سے خشکی نکال رہا ہوں۔''

''ہوں۔ لیکن تمہاری سر کی خشکی کبھی نہ جائے گی۔ خشکی آم کی گٹھلی سے نہیں جاتی عقل سے جاتی ہے۔'' اس پر سب لڑکے ہنس پڑے۔